ڈاکٹر طاہر مسعود قاضی

اسلامی حکومت کی تعبیر وتشکیل

قانون سازی،حکومت اور اختیار ہر ایک کا آپس میں ایک گہرا ربط اور تعلق ہے۔حکومت کا لفظ اپنے دونوں اطراف میں ایک واضح کردار اور اثر رکھتا ہے۔حکومت وہ ہیئت حاکمہ ہے جو حکم کو نافذ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔حکومت کا سرچشمہ حکم ہے جو جماعت حکم کے منبع سے سیراب ہوتی ہے وہ حکومت کہلاتی ہے اور قانون سازی وہ ماخذ حکم ہے جو کسی حاکم مجاز کی جانب سے حکم کے بیان پر مشتمل ہو۔جب کہ اختیار حکومت کے حکم کی سلطنتِ وضع وتنفیذ سے عبارت ہے۔

اسلامی حکومت کے قیام میں اسلامی نظام کے مسلمہ معتقدات ونظریات کی اثر پذیری ایک لازمی امر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسی حکومت میں قرآن وسنت کو بالاتر اور مستقل ماخذ قانون تسلیم کیا جاتا ہے۔مگراس صورت حال میں انسانی ضرورت و احتیاج اور مصلحت کے پیش نظر قرآن وسنت کی روشنی میں قانون سازی کے اختیار کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔یعنی مصلحت مرسلہ، اسلامی قانون کا وہ تغیر پذیر حصہ ہے جس میں قانون سازی کا ایک وسیع میدان موجود ہے۔لیکن مصلحت مرسلہ کی بناء پر قانون سازی کے اختیار کو حکومت کس حد تک استعمال کرسکتی ہے؟اس سوال کا جواب آئندہ کے صفحات پر اسلامی حکومت کی تعبیر وتشکیل، قانون سازی کا حکومتی اختیار اور مصالح مرسلہ کی روشنی میں حکومت کی قانون سازی کے دائرہ عمل کے مباحث میں تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مبحث اول: اسلامی حکومت: عنوان اور قیام

پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست قائم کرتے ہوئے وحی خداوندی کی ہدایت کے مطابق نبوی حکومت کا اجراء کیا۔ جس کی بنیاد اس حاکمیت الٰہیہ اور دینی وحدت پر قائم کی گئی جس میں عربوں کی شیرازہ بندی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ صحابہ کرامؓ کے دل و دماغ نے مصطفوی حکومت کا اتنا گہرا اثر قبول کیا کہ بہت سوں کو آپ ﷺ کے سانحہ ارتحال کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی جانشینی کا سوال انتہائی اہم تھا۔ خود رسالتمآب ﷺ نے اپنی حیات ظاہری میں اپنی جانشینی کا فیصلہ بھی صادر نہ کیا تھا۔ لیکن اس نازک وقت میں صحابہ کرامؓ نے غیر معمولی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کی جانشینی کا مسئلہ حل کر لیا اور ثقیفہ بنی ساعدہ کے اجلاس میں پوری آزادی کے ساتھ مباحثہ میں حصہ لینے کے بعد انصار و مہاجرین صحابہ کے معتمد علیہ نمائندوں نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر دوسرے روز مسجد نبوی ﷺ میں بیعت عامہ ہوئی جس میں سب لوگ شریک ہوئے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے لیے حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ خلافت کا نقطۂ آغاز تھا۔ جس میں صحابہ کرام نے اجتماعی طور پر حضور ﷺ کی جانشینی کے مسئلہ کو حل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں مسلمان حکمران کو خلیفۃ الرسول سمجھا جاتا ہے:

یکون یخلف النبی ﷺ فی امتہ۔(۱)

کہ وہ امت میں نبی ﷺ کا جانشین ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت کے عنوان:

فقہ اسلامی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت کے لیے تین اصطلاحیں: خلافت، امامت اور امارت استعمال کی گئیں۔ اسلامی حکومت کے لیے یہ تینوں اصطلاحی عنوانات بظاہر مترادف معلوم ہوتے ہیں اور کسی حد تک انہیں استعمال بھی اسی طرح کیا گیا

ہے۔لیکن بنظر غائر مطالعہ کرنے سے جو مفاہیم اجاگر ہوتے ہیں ان پر محققین نے روشنی ڈالی ہے۔لہذا متذکرہ اصطلاحات کے جو تشریحاتی مفاہیم محققین نے متعین کیے ہیں ان کی روشنی میں ان اصطلاحات کا مطالعہ ذیل میں کیا جارہا ہے۔

۱۔ **خلافت:**

لفظ خلافت کا مادہ خلف ہے۔جس کے لغوی معنی پچھلی جانب، پیچھے رہنا یا کسی کی جگہ لینا اور بعد میں آنے والے کے ہیں۔قرآن حکیم میں خلف کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ۔(۲)

جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے☆

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً۔(۳)

سو آج ہم بچالیں گے تیرے جسم کو (سمندر کی تند موجوں سے) تا کہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لیے (عبرت کی) نشانی۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِى الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ۔(٤)

اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسا دیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے۔☆

امام راغب اصفہانی تحریر کرتے ہیں:

وخلف فلان فلانا قام بالامر عنه اما معه و اما بعده .....والخلافة عن نيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشريف المستخلف وعلى هذا الوجه وجه الاخير استخلف اللّٰه اولياء ه فى الارض۔(۱)

فلاں شخص فلاں کا خلیفہ ہے۔یعنی اس کی جانب سے کام کرنے کا ذمہ

دار بنایا گیا ہے۔ چاہے اس کی معیت میں یا اس کے بعد اور خلافت کسی دوسرے کی نیابت کرنا ہے۔ چاہے منوب عنہ کے غائب ہونے کی بناء پر ہو یا اس کی موت کی وجہ سے۔ اور یا اس کے عاجز ہونے کی بناء پر یا پھر جسے خلیفہ بنایا جارہا ہے اس کو شرافت اور بزرگی عطا کرنے کی وجہ ہو۔ اور اسی آخری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

خلافت کے اصطلاحی مفہوم کو اس طرح متعین کیا گیا ہے:

الرياسة العامة فى الدين والدنيا فى نيابة الرسول ﷺ۔(۲)

خلافت وہ ریاست عامہ ہے جو دینی اور دنیاوی امور میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت میں کام کرتی ہو۔

اسے اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے:

فهى (الخلافة)فى الحقيقة:خلافة عن صاحب الشرع فى حراسة الدين وسياسة الدنيا به۔(۳)

پس یہ خلافت حقیقت میں شارع کی نیابت و جانشینی ہے دین کی حفاظت کرنے اور اس کے ساتھ دنیا کی سیاست (دنیوی حکومت قائم کرنے) کرنے میں۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ نے خلافت کی تعریف میں تحریر کیا ہے:

هى الرئاسة العامة فى التصدى لاقامة الدين۔(٤)

یہ عمومی سربراہی ہے اقامت دین کی جانب عملاً متوجہ رہتے ہوئے۔

ان تمام تعریفات سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت ایک عمومی سربراہی کا نام ہے جس میں اقامت دین کے لیے عملی اقدامات اور حکومت کے نظم ونسق کی تنظیم اور اس کے قیام کا

مفہوم شامل ہے۔خلافت مسلمانوں کا وہ مذہبی اور سیاسی مرکز ہے جو پیغمبر انسانیت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی نیابت سے حاصل ہوتا ہے۔اسلامی طرز فکر میں خلافت ایک نیابتی طرز حکومت ہے جس میں براہ راست حق فرمانروائی کی بجائے نیابتی حکومت کے فرائض کا عمل دخل ہے۔یعنی خلافت میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور پھر نیابتی حیثیت میں رسول اللہ ﷺ کی قانونی حکمرانی کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔خلیفہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔یا پھر نصوص شریعت کی عدم موجودگی میں نصوص قرآن و سنت کی روشنی میں ہی ارباب شوریٰ کی مشاورت سے صلاح وفلاح عامہ کے لیے قانون بنا کر نافذ کرتا ہے۔اسلامی تاریخ میں خلافت کا مثالی دور خلفاء راشدین کا عہد ہے۔

۲۔ امامت:

امام کا لفظ اپنے اندر راہنما اور پیشوا کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔(۱)

اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجا لایا۔اللہ نے فرمایا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔☆

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔ (۲)

اور ہم نے بنایا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ رہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے۔☆

امامت کی اصطلاحی تعریف اس طرح درج کی گئی ہے:

الامامة:موضوعة لخلافة النبوة فی حراسة الدين وسياسة

الدنیا۔(۳)

امامت :نبوت کی خلافت کے لیے دین کی حفاظت اور نظم و نسق دنیا چلانے کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔

السید شریف جرجانی نے اس حوالے سے اس طرح تحریر کیا ہے:

الامام الذی له الریاسة العامة فی الدین و الدنیا جمیعاً۔(٤)

امام وہ ہے جس کے پاس دین و دنیا سب کی عمومی سربراہی ہو۔

احناف نے ایک اور تعریف اس طرح درج کی ہے:

وعرفها فی المقاصد انها ریاسة عامة فی الدین و الدنیا خلافة عن النبی ﷺ۔(٥)

مقاصد (کتاب) میں امامت کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ امام وہ ہوتا ہے جس کو دین و دنیا کے امور میں ریاست عامہ حاصل ہو اور وہ نبی ﷺ کا خلیفہ ہو۔

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ خلافت اور امامت کی اصطلاحوں کو اسلامی لٹریچر میں مترادف کے طور پر برتا گیا ہے۔ابن خلدون کے مطابق خلیفہ کو امام اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسے امام نماز کے مشابہ قرار دیا گیا ہے کہ جیسے مقتدی پر امام کی پیروی لازم ہے اسی طرح تمام رعایا کو خلیفہ کی پیروی بھی لازم ہے اس لیے خلافت کو امامت کبریٰ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔(۱) اسلامی حکومت کے سربراہ کو رسول اللہ ﷺ کی نیابت کے حوالے سے خلیفہ کہا جاتا ہے اور لوگوں پر اس کے وجوب اطاعت کے حوالے سے اسے امام کہا جاتا ہے۔اور امامت کی دو قسمیں ہیں۔ایک صغریٰ اور دوسری کبریٰ۔ان کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے:

الامامة هی صغریٰ و کبریٰ فالکبریٰ استحقاق تصرف عام علی الانام و تحقیقه فی علم الکلام۔(۲)

امامت دو قسم کی ہے ایک صغریٰ اور دوسری کبریٰ پس امامت کبریٰ وہ ہے جس میں مخلوق پر عام تصرف کا حق حاصل ہو اور اس کی تحقیق علم کلام میں مذکور ہے۔

جب کہ امامت صغریٰ نماز پنجگانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور امامت کبریٰ مملکت کی سربراہی کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔محراب ومنبر کی امامت باوجود فرض عین کے امامت صغریٰ کہلاتی ہے اور حکومت وسلطنت کی امامت کو امامت کبریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ امامت اپنی اصل کے اعتبار سے عام قیادت ہے اور پیغمبر اعظم ﷺ کی نسبت سے خلافت جو نیابتی حکومت کی خود شناس ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے اور اسلام کے اجتماعی نظام کو زعیم بن کر چلاتی ہے۔ہمارے علمائے اجتماعیات نے اسلام کے طرز حکومت کو شاندار ظاہر کرنے کے لیے امامت کو امامت عظمیٰ ،امامت کبریٰ ،امامت عامہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

امامت کے تمام فلسفہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

امامت ایک ایسی ریاست عامہ (Leadership of democratic government) کا نام ہے۔جو پیغمبر اعظم ﷺ کی قانونی نمائندگی سے حاکمانہ بالادستی حاصل کرتی ہے اور دنیا و دین کی اجتماعی سرگرمیوں میں اپنی عظمت و طاقت کا اس طرح اظہار کرتی ہے کہ اس میں اعلیٰ راہنمائی کے اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔(۳)

۳۔ امارت:

لفظ امارت دراصل امر سے ماخوذ ہے۔جس کے معنیٰ حکم کے ہیں۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اَلا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۔(۱)

سن لو! اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔☆

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۔(۲)

کہتے ہیں کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے۔آپ فرمایئے اختیار تو سارا اللہ کا ہے۔☆

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔(۳)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذی شان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں۔☆

نظریہ امارت کی ساری عمارت لفظ امر پر قائم ہے:

اسلام کے قانون میں چار لفظ ایسے پائے جاتے ہیں جن سے امارت کا تصور ہوتا ہے۔امر اللہ، امر النبی ﷺ، اولی الامر، امراء المسلمین ۔امر اللہ کا لفظ خدا کی حکومت قائم کرتا ہے۔امر النبی ﷺ کا لفظ خدا کی حکومت کی ذمہ داریوں کو پیغمبر کے اختیار میں دیتا ہے۔اولی الامر کے لفظ سے خدا کے ان صالح اور رشید بندوں کی مجلس حکومت قائم ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں حکومت کا اختیار پیغمبر خدا کے قانونی جانشینوں کی حیثیت سے آتا ہے اور امیر المومنین اس شخص واحد کا سرکاری خطاب بنتا ہے جس کو مسلمان امیر بناتے ہیں۔(۴)

امارت کا ایک مفہوم ولایت بھی ہے:

الامارة بالكسر الولاية .....الامير من تولىٰ امر قوم۔ (۵)

امارت کسرہ کے ساتھ ولایت ہے اور امیر وہ ہے کہ جسے قوم کا کوئی امر

سونپا گیا ہو۔

اسلامی حکومت کے ان تینوں عنوانات پر ایک تبصرہ اس طرح تحریر کیا گیا ہے:

الامامة العظمیٰ او الخلافة او امارة المومنین کلها تؤدی معنی واحدا،وتدل علی وظیفة واحدا هی السلطة الحکومة العلیا،وقد عرفها علماء الاسلام بتعاریف متقاربة فی الفاظها،متحدة فی معانیها تقریبا۔(۱)

امامت عظمیٰ یا خلافت یا مومنین کی امارت سب (اصطلاحات) ایک ہی مفہوم لیے ہوئے ہیں اور ایک ہی کام پر دلالت کرتے ہیں جو کہ حکومت علیا کا غلبہ و اقتدار ہے۔علماء اسلام نے ان کی تعریفیں ملتے جلتے الفاظ میں کی ہیں جن کا تقریباً ایک جیسا مفہوم ہے۔

مذکورہ اصطلاحات کے قانونی فرق کو اس طرح واضح کیا گیا ہے:

خلافت، امامت اور امارت کی اصطلاحیں ہماری فقہ و کلام کی بعض کتابوں میں بالکل مترادف اسلامی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہوگئی ہیں۔جس کے سبب سے بعض اوقات خلط مبحث سا ہوجاتا ہے۔اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر قائم شدہ ریاست کے لیے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے اداروں کی تنفیذ کرتی ہے اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔دوسرے الفاظ میں اس کو یوں

سمجھیے کہ جو فرق سٹیٹ اور گورنمنٹ کے درمیان ہے وہی فرق خلافت اور امامت و امارت کے درمیان ہے۔(۲)

اس بحث سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی ریاست کو خلافت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے سربراہ کو خلیفہ کہا گیا ہے جسے نبی مکرم ﷺ کی نیابت حاصل ہوتی ہے۔اور خلافت کے اندر ہی امامت کا مفہوم بھی شامل ہے۔غالبا یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے انہیں بطور مترادف اصطلاحوں کے استعمال کیا ہے۔اور اگر امامت کو الگ اصطلاح کے سمجھا جائے تو یہ عصر حاضر کی اصطلاح حکومت کے مترادف ہے۔جب کہ امارت کی اصطلاح تو امامت کی بھی فرع کے طور پر سامنے آتی ہے۔لیکن فقہی ذخیرہ میں بکھرے مباحث کا نچوڑ اور لب لباب وہ اسلامی طرز حکومت ہے جسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ امامت و امارت بطور فرع کے خلافت کے اندر ہی شامل ہیں۔اس لیے اسلامی حکومت سے مراد خلافت کا نظام حکومت ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت واہمیت:

اسلامی طرز فکر میں حکومت کو خلافت سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کے سربراہ کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔جو کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی نیابت وقائم مقامی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔لہذا نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی نیابت کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں میں ایک خلیفہ موجود ہو۔جو ان کے دنیوی مصالح کا نگران ہو، دین اسلام کے تحفظ کا ذمہ دار ہو اور مسلمانوں کے آزادی عقیدہ و مذہب اور حفاظت نفس و مال کا ضامن ہو۔اور جب وہ موجود ہو گا تو اسلامی حکومت قائم رہے گی۔اس کی ضرورت واہمیت کا اندازہ اس آیت مبارکہ سے کیا جا سکتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔(۱)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو (اپنے

ذیشان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں۔☆

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔(۲)

اور دعا مانگا کیجیے کہ اے میرے رب! جہاں کہیں تو مجھے لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آ سچائی کے ساتھ لے آ اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو۔☆

خود رسالتمآب ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا:

انما الامام جنة یقاتل من ورائه و یتقی به۔(۳)

اور امام (اسلامی حکومت کا سربراہ) سپر اور ڈھال ہے قتال کیا جاتا ہے اس کے پیچھے سے اور اس کے ذریعے بچاؤ کیا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے آثار میں ہے کہ:

واللّٰہ ما یزع اللّٰہ بسلطان اعظم مما یزع بالقرآن۔(٤)

اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ حکومت کے ذریعے جن برائیوں کا سد باب کرتا ہے وہ ان سے زیادہ ہے جن کا سد باب قرآن کرتا ہے۔

اس کی اہمیت کو اس طرح اجاگر کیا گیا ہے:

ان الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفات النبی ﷺ نصب الامام حتی قدموه علی الدفن۔(۱)

امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کے نزدیک امام کا تقرر اہم مقاصد میں سے ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام نے امام کا تقرر نبی ﷺ کی وفات کے فوراً بعد کیا حتی کہ آپ کے دفن سے قبل اس کو سرانجام دیا۔

فقہاء اسلام نے اس تمام تناظر میں نصب امام یعنی اسلامی حکومت کے قیام اور تقرر

امام کو اجماع امت کی دلیل سے واجب قرار دیا ہے۔(۲) وجوب امامت پر تمام اہلسنت ،مرجئہ ،شیعہ اور جمیع خوارج کا اتفاق ہے ان سب کی رائے میں ایک امام عادل کی اطاعت ضروری ہے جو خدا کے احکام کو جاری کرتا ہو اور لوگوں کو ان احکام پر چلاتا ہو جو نبی کریم ﷺ لائے تھے۔امام ماوردی اس مسئلہ پر اس طرح حکم لگاتے ہیں:

فاذا ثبت وجود الامامة ففرضها على الكفايه كالجهاد وطلب العلم، فاذا اقام بها من هو من اهلها سقط فرضها عن الكافة۔(۳)

جب امامت کا وجوب ثابت ہو گیا تو یہ اپنے حکم میں جہاد اور حصول علم کی طرح فرض کفایہ ہے۔اگر کوئی اہل لوگوں میں سے امام بن گیا تو تمام لوگوں سے یہ ذمہ داری ساقط ہو گئی۔

،نبوت کی جانشینی جسے خلافت یا امامت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے ثبوت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا یہ از روئے عقل ثابت ہے یا از روئے دلیل سمعی اور پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ تقرر امام کس پر واجب ہے:

انما الخلاف فی انه یجب علی اللّٰه او علی الخلق بدلیل سمعی او عقلی والمذهب انه یجب علی الخلق سمعا۔ (٤)

اختلاف اس امر میں ہے کہ امام مقرر کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے یا مخلوق پر اور یہ وجوب دلیل نقلی سے ثابت ہے یا دلیل عقلی سے اور اہلسنت کا مذہب یہ ہے کہ امام کا تقرر مخلوق پر واجب ہے دلیل نقلی سے۔

مذکورہ اختلاف کے دوسرے گروہ ''شیعہ'' کے نقطہ نظر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وقال الشیعة الامامیة:تجب الامامة عقلا فقط للحاجة الی زعیم

یمنع التظالم، ویفصل بین الناس فی التنازع والتخاصم ولولا الولاۃ لکان الامر فوضیٰ.....والاسماعیلیۃ قالوا بوجوبھا عقلا علی اللّٰہ لا علی الامۃ۔(۱)

اور شیعہ امامیہ کہتے ہیں کہ امامت صرف دلیل عقلی سے واجب ہے محض ضرورت کے لیے کہ ظلم کو روکنے میں معاون ہو اور اسی سے لوگوں کے جھگڑوں میں فیصلہ ہوتا ہے اور اگر والی نہ ہوں تو نظام درہم برہم ہو جائے.....اور شیعہ اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ امامت دلیل عقلی سے اللہ تعالیٰ پر واجب ہے نہ کہ امت پر۔

شیعہ کے امامیہ فرقہ کے نزدیک امامت وہ الٰہی منصب ہے جو نبوت کی طرح پروردگار عالم کی جانب سے ملتا ہے:

نعتقد ان الامامۃ کالنبوۃ الا بالنص من اللہ تعالی علی لسان رسولہ اولسان الامام المنصوب بالنص اذا اراد ان ینص علی الامام من بعدہ وحکمھافی ذلک حکم النبوۃ بلا فرق فلیس للناس ان یتحکموا فی من یعینہ اللہ ھادیا و مرشداً لعامۃ البشر، کما لیس لھم حق تعیینہ او ترشیحہ او انتخابہ۔(۲)

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ امامت نبوت کی طرح ہے جو کہ ممکن ہی نہیں ما سوائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول ﷺ کی زبان پر یا امام منصوب کی زبان پر نص کے بغیر جب وہ اپنے بعد کے امام پر کوئی نص قائم کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔اور امامت کا حکم اس میں نبوت کی طرح ہے بغیر کسی فرق سے پس لوگوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس میں فیصلہ کریں جسے اللہ نے عام انسانوں کے لیے ہادی اور مرشد متعین

کیا ہے۔ جیسا کہ ان کے لیے یہ حق نہیں کہ وہ اسے متعین کریں یا اس کا انتخاب کریں۔

بلکہ شیعہ کا واضح عقیدہ یہ ہے:

الامام یجب ان یکون منصوصا علیه ۔(۳)

یہ واجب ہے کہ امام پر نص قائم ہو۔

لیکن شیعہ غیبت امام (بارہویں امام کی غیبت) پر یقین رکھتے ہیں لیکن باوجود ان کی عدم موجودگی میں ان کے والی کے تقرر کو عقلا جائز بھی خیال کرتے ہیں اور اس کی ضرورت کو بھی محسوس کرتے ہیں۔(۱)

اس بحث سے یہ عیاں ہے کہ تمام فقہی مذاہب نے اسلامی حکومت جسے خلافت یا امامت سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی اہمیت وضرورت کو سمجھتے ہوئے اس کا نہ صرف اقرار کیا ہے بلکہ اپنے اپنے فقہی اصولوں کے مطابق اس پر بحث کرتے ہوئے اس مسئلہ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ شیعہ نے امامت کو نبوت پر قیاس کرتے ہوئے اسے اللہ رب العزت پر واجب قرار دے کر اپنی تفہیم کے مطابق اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ جب کہ اہلسنت نے کتاب و سنت اور تعامل صحابہ سے دلیل پکڑتے ہوئے اس کے قیام کو امت پر واجب قرار دے کر ہر زمانے اور سوسائٹی کا مسئلہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اور مجموعی طور پر امت مسلمہ کو اس سارے عمل میں شامل کر کے اسلامی حکومت کے قیام کی عملی اہمیت کی نشاندہی کی ہے۔

یہ بات تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ عہد رسالتمآب ﷺ اور عہد صحابہ کرام ؓ میں اسلام، نظام سلطنت کے ہر پہلو پر محیط تھا کیونکہ اسلام ایک جامع دین ہے اور اسلامی ریاست وحکومت اس کا ایک اہم جز ہے۔ جو نفاذ اسلام کے لیے عملی اقدامات کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اسلام اپنے تمام احکامات وتعلیمات کے ساتھ بطور ایک زندہ قوت کے اسلامی ریاست میں اسلامی حکومت کے ذریعے ہی پوری طرح نافذ العمل ہوسکتا ہے۔ اس سے یہ

بات سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہتی کہ اسلام کے مکمل نفاذ کے لیے اسلامی حکومت کے قیام کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ یہ انتہائی اہم بھی ہے۔ شیخ ابن تیمیہ نے اسلامی حکومت کی اہمیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

یجب ان یعرف ان ولایۃ امر الناس من اعظم واجبات الدین، بل لا قیام للدین الا بھا۔(۲)

اسلامی حکومت کا قیام دین کے واجبات میں سے بلند ترین فرض ہے بلکہ اس کے بغیر دین قائم ہی نہیں ہوسکتا۔

مبحث دوم: اسلامی حکومت کی تشکیل

اسلام نے تشکیل حکومت کے سلسلہ میں جو طرز عمل اختیار کیا ہے۔ وہ مشاورت کا شورائی طریق ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت کے تشکیلی عناصر دو ہیں۔ ایک امامت یا خلافت جس کا سربراہ خلیفہ یا امام کہلاتا ہے۔ اور دوسرا مجلس شوریٰ۔ سب سے پہلا اور اہم مسئلہ اسلامی حکومت کے سربراہ کا تقرر ہے۔ جسے اسلامی تاریخ میں خلیفہ، امام اور امیر کی اصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس مسئلہ کی تفہیم میں ہماری مدد کرتی ہے۔

ا۔ اسلامی حکومت کے سربراہ کا تقرر:

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں اپنی جانشینی کے متعلق کوئی صراحت یا قطعی ہدایت نہ فرمائی تھی اس پیغمبرانہ سکوت اور قرآن حکیم کے واضح ارشاد:

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔(۱)

اور ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔☆

سے صحابہ کرام نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد اسلامی حکومت کے سربراہ کا تقرر مسلمانوں کے اپنے انتخاب پر موقوف ہے۔ تاہم یہ انتخاب باہمی مشاورت کے اصول پر ہونا چاہیے۔ صحابہ کرام کی اسی تفہیم اور غیر معمولی فہم و فراست کے مظاہرے میں رسول

اللہ ﷺ کے معاً بعد آپ کے جانشین اور اسلامی حکومت کے سربراہ کا مسئلہ ثقیفہ بنی ساعدہ کی اسمبلی میں حضرت ابو بکر کا انتخاب بطور خلیفہ اول اتفاق رائے سے طے کر دیا تھا۔اور پھر دوسرے دن بیعت عام کے ذریعے توثیق خلافت کی گئی۔(۲)

خلیفہ اول نے اپنے آخری وقت میں شوریٰ ء خاص جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ،عثمان بن عفان ،سعید بن زید ، اسید بن حضیر اور دیگر جلیل القدر مہاجرین و انصار صحابہ کرام شامل تھے کو بلا کر اپنے جانشین کے بارے میں مشاورت کی اور پھر حضرت عمر کی بابت حضرت عثمان کو اپنی وصیت املا کروائی۔(۳) خود حضرت ابو بکر نے اپنے گوشے سے جھانک کر لوگوں سے پوچھا:

أترضون بمن استخلف علیکم ؟فانی واللّٰہ ما الوت من جھدی الرأی ولا ولیت ذا قرابۃ وانی استخلف عمر بن الخطاب فاسمعوا لہ واطیعوا۔(٤)

کیا تم اس شخص پر راضی ہو جسے میں تم پر اپنا جانشین بنا رہا ہوں؟اللہ کی قسم میں نے رائے قائم کرنے کے لیے غور وفکر میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور نہ ہی اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر کیا ہے۔میں نے عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنایا ہے پس تم ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

لوگوں نے جب یہ سنا تو متفق ہو کر بیک زبان کہا :سمعنا و اطعنا ہم نے سن لیا اور مان لیا۔لیکن اس کے باوجود اس پر استصواب عام کروایا گیا۔اور پھر بیعت عام کے ذریعے تقرر خلافت مکمل ہوا۔گویا استخلاف عمر کے طریق کار میں بھی مشاورت اور انتخاب کی جمہوری روح کارفرما ہے۔حضرت عمرؓ جب زخمی ہو گئے تھے۔اور ان کی رخصت کا وقت قریب آ گیا تھا تو اس وقت انہوں نے چھ جلیل القدر قریشی صحابہ پر مشتمل انتخابی مجلس شوریٰ بنا دی اور ان سے فرمایا:

قوموا فتشاوروا فامروا احدکم۔(۵)

اٹھو مشورہ کرو اور اپنے میں سے کسی کو امیر بنالو۔

خلیفہ کے انتخاب کا یہ مسئلہ سب سے پہلے مذکورہ چھ رکنی مجلس انتخاب میں زیر غور لایا گیا جہاں دو افراد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نامزد ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جو ناظم انتخاب مقرر ہوئے تھے انہوں نے اہل مدینہ کے ساتھ طویل مشاورت کی اور لوگ تین دن رات تک ان کے پاس آ کر اپنی رائے دیتے رہے۔ اس استصواب عام کے ذریعے کثرت رائے سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب بطور خلیفہ ثالث کے عمل میں آیا۔ اور مجمع عام میں بیعت کے ذریعے ان کی خلافت کی توثیق کی گئی۔(۱) حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کئی اصحاب رسول ﷺ نے حضرت علیؓ کے گھر پر جمع ہو کر ان سے خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے انکار کر دیا مگر لوگ مسلسل اصرار کرتے رہے تو آپ نے فرمایا:

فان بیعتی لا تکون خفیاً ولا تکون الا عن رضاء من المسلمین۔(۲)

میری بیعت خفیہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مسلمانوں کی آزاد مرضی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن ہے۔

حضرت علیؓ نے شوریٰ کے متعلق ارشاد فرمایا:

انما الشوریٰ بالمهاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل و سموه اماما کان ذلك لله رضی۔(۳)

اور رہا مشاورت کا معاملہ تو وہ مہاجرین و انصار کا حق ہے۔ اگر وہ متفق ہو کر کسی کو امام بنالیں تو اللہ کی رضا بھی اس کے حق میں ہوگی۔

پھر حضرت علیؓ جب قاتلانہ حملے کے نتیجے میں زخمی ہوئے اور آپ کا وقت رحلت قریب آیا۔ تو آپؓ کے بعد بطور جانشین حضرت امام حسنؓ کی بیعت کے حوالے سے آپؓ سے

پوچھا گیا تو اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا:

ما امرکم ولا انھاکم،انتم ابصر۔(٤)

میں تمہیں نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں ،تم خود (معاملہ کو) اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔

حضورﷺ کے بعد خلافت راشدہ کے لیے چار مرتبہ اسلامی حکومت کے سربراہ کا تقرر عمل میں آیا۔سب سے پہلے ۱۱ ہجری میں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ رسول اللہﷺ مقرر ہوئے۔ دوسری مرتبہ تیرہ ہجری میں حضرت عمرؓ اسلامی حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے اور مسند خلافت پر بیٹھے۔تیسری دفعہ چوبیس ہجری میں حضرت عثمانؓ کو اسلامی حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا اور چوتھی بار پینتیس ہجری میں حضرت علیؓ بطور خلیفہ اسلامی حکومت کے سربراہ ہوئے۔ان چاروں عہد میں خلیفہ کے تقرر کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ انتہائی اہم ہے۔متذکرہ تاریخی تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پہلی مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کو بذریعہ شوریٰ اور بیعت عام کی توثیق کے ساتھ خلیفہ مقرر کیا گیا،دوسری مرتبہ حضرت عمرؓ کا بذریعہ تجویز اور شوریٰ اہل حل وعقد کے علاوہ تائید وتوثیق عامہ کے تحت بطور خلیفہ تقرر ہوا،تیسری دفعہ بذریعہ مجلس انتخاب اور استصواب رائے عامہ کے بعد بیعت عام کے ساتھ حضرت عثمانؓ اسلامی حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے چوتھی بار بذریعہ اہل شوریٰ اور بیعت عام کے ساتھ حضرت علیؓ بطور خلیفہ اسلامی حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے۔اس تمام سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ خلفاء راشدین کا اسلامی حکومت کے سربراہ کے طور پر تقرر بذریعہ عوامی انتخاب تو نہیں ہوا البتہ ارباب حل وعقد کے ذریعے انتخاب کے بعد بیعت عام کے ذریعے اس کی تائید وتوثیق ضرور کرائی گئی۔اور ایک مسلسل اصول جو چاروں خلفاء راشدین کے تقرر میں نظر آتا ہے وہ شوریٰ اور بیعت عام کا تسلسل ہے۔حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں نظام شوریٰ کا دخل زیادہ تھا۔حضرت عمرؓ کا تقرر بھی جمہوری اصول کے مطابق ہوا،حضرت عثمانؓ کا تقرر حضرت عمرؓ کے مقابلے میں نظام شوریٰ سے

بہت زیادہ قریب تھا اور حضرت علیؓ کی بیعت و خلافت بھی جمہوری نظام پر مبنی تھی۔

صحابہ کرامؓ کے چاروں مرتبہ کے تعامل نے یہ طے کر دیا کہ خلیفہ کے تقرر کے لیے وراثتی نظام کا کوئی دخل نہیں۔ اور نہ ہی کوئی شخص زبردستی لوگوں کی مرضی کے بغیر مسلط ہو کر اسلامی حکومت کا سربراہ بن سکتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام نے ہر مرتبہ بیعت عام سے خلافت کی تائید و توثیق کرائی۔ جو ایک اجتماعی آئینی معاہدہ ہے۔ اس میں امام اور عوام براہ راست ایک دوسرے سے آئینی معاہدہ کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں ابن قدامہ نے تحریر کیا ہے:

ان من اتفق المسلمون علی امامته و بیعته و وجبت معونته۔(۱)

جس حکومت پر مسلمانوں نے اتفاق کر لیا اور اس کی بیعت کر لی (تو اس کی حکومت قائم ہوگئی) تو اب اس کی معاونت لازم ہوگئی۔

تو گویا بیعت کے ساتھ ہی اسلامی حکومت کے سربراہ کا تقرر مکمل ہو جاتا ہے۔

اس حوالے سے محققین نے لکھا ہے:

لقد اجمع المسلون ما عدا الشیعة الامامیة علی ان تعیین الخلیفة یتم بالبیعة۔(۲)

تمام مسلمان ماسوائے شیعہ امامیہ کے اس پر متفق ہیں کہ خلیفہ کا تعین و تقرر بیعت کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے۔

شیعہ نے امامت کے متعلق یہ موقف اختیار کر رکھا ہے کہ امامت کا منصب نبوت کی طرح توقیفی ہے اس لیے وہ اسلامی حکومت کے سربراہ کے تقرر میں امامت کے حوالے سے نص کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن بقول سید مودودی:

یہ اختلاف اب عملاً یوں ختم ہو گیا ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک بھی بارہویں امام کی غیبت کے بعد چونکہ منصب امامت ان کے ظہور ثانی تک موقوف ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی اجتماعی معاملات کی سربراہی

اب بہر حال کسی غیر مامور من اللہ ہی کے سپرد ہونی چاہیے۔(۱)

بہر طور خلفاء راشدین کے طرز عمل کو مد نظر رکھتے ہوئے اہل شوری کی مشاورت اور بیعت کے متحرک اصولوں کے مطابق اسلامی حکومت کے سربراہ کے متعلق علماء نے تحریر کیا ہے:

فاذا اجتمع اهل العقد والحل الاختيار ، تصفحوا احوال اهل الامامة الموجودة فيهم شروطها ، فقدموا للبيعة منهم اكثرهم فضلاً، واكملهم شروطاً، ومن يسرع الناس الى طاعته ولايتوقفون عن بيعته۔(۲)

پس جب اہل حل وعقد ایک جگہ جمع ہو جائیں تو منصب امامت کے لیے موزوں افراد کے احوال کا جائزہ لیں جن میں شرائط اہلیت موجود ہوں تو بیعت کے لیے اسے آگے لائیں جو ان میں سے زیادہ صاحب فضل، شروط میں زیادہ کامل اور جس کی اطاعت پر لوگ جلد تیار ہو جائیں۔ایسے شخص کی بیعت میں توقف نہیں کرنا چاہیے۔

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی تقرری میں اہلیت اور عوام کی رائے کو پوری طرح اہمیت حاصل ہے اور انہی کی رائے سے یہ تقرر مکمل ہوتا ہے۔تاہم یہ رائے بالواسطہ لی جائے یا بلا واسطہ کوئی بھی طریق کار زمان و مکان کی تبدیلیوں اور احوال وظروف کے مطابق اختیار کیا جاسکتا ہے جس پر اسلام نے کسی طرح کی کوئی قیود عائد نہیں کر رکھی ہیں۔البتہ اس طریقہ کار میں مشاورت کی حقیقی روح بہر طور موجود رہنی چاہیے۔

۲۔ شرائط امارت:

اسلام کے فقہی ذخیرہ میں امارت کے لیے دو طرح کی شرائط ذکر کی گئی ہیں۔ایک تو وہ بنیادی نوعیت کی قانونی شرائط ہیں جن پر امارت کی اہلیت کا انحصار ہے۔اور ان کے بغیر کسی

کی اہلیت امارت تصور ہی نہیں کی جاسکتی مثلاً مسلمان ہونا ، عاقل ، بالغ ،مرد اور آزاد باشندہ ہونا وغیرہ اور دوسری وہ ضروری قانونی شرائط ہیں جو منصب امارت کے اعتبار سے اہلیت کے لیے ناگزیر ہیں۔مثلاً عادل ہونا،ذی علم ہونا،شجاع ہونا وغیرہ ۔علماء اسلام نے امارت کے لیے دونوں سطح کی شرائط اہلیت کو قانونی اہمیت کے پیش نظر بغیر کسی تقسیم وتفریق کے ایک ہی روانی میں بیان کیا ہے۔جس سے یہ بات سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہتی کہ امارت کے لیے وہ تمام شرائط جو فقہی ذخیرہ میں مندرج ہیں انہیں ناگزیر تصور کیا گیا ہے۔امامت کی اہلیت کے لیے جن سات شرائط کو ضروری سمجھا گیا ہے ان میں عدالت ،علم ،صحت حواس ،صحت اعضاء،فہم وفراست ،شجاعت اور قریشی النسب ہونا شامل ہیں۔(۱)احناف نے شرائط امامت کو سات کے عدد میں ہی منحصر کرتے ہوئے انہیں اس طرح بیان کیا ہے:

ویشترط کونه مسلما حرا ذکرا عاقلا بالغا قادرا قرشیا۔(۲)

اور امام ہونے کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان، آزاد، مرد، عاقل ، بالغ ، قدرت والا ،اور قریشی ہو۔

شاہ ولی اللہ نے خلافت کے حوالے سے خلیفہ کے لیے شرائط کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

انه یشترط فی الخلیفة:ان یکون عاقلا، بالغا، حرا، ذکرا، شجاعا، ذارأی وسمع و بصر ونطق،وممن سلم الناس شرفه وشرف قومه، ولا یستکفون عن طاعته،قد عرف منه انه یتبع الحق فی سیاسة المدنیة ، هذا کله یدل علیه العقل،واجتمعت امم بنی آدم علی تباعد بلدانهم واختلاف ادیانهم علی اشتراطها،لما رأوا ان هذه الامور لا تتم المصلحة المقصودة من نصب الخلیفة الا بها،واذا وقع شیء من اهمال هذه رأوه خلاف ما ینبغی ، وکرهه قلوبهم وسقطوا علی غیظ وهو قوله

ﷺ فی الفارس لما ولواعلیه امرأة : لن یفلحوا قوما ولوا امرهم امرأة ۔والملة المصطفویة اعتبرت فی خلافت النبوة امورا اخریٰ : منها : الاسلام،والعلم،والعدالةوذلك لان المصالح الملیة لا تتم بدونها ضرورة : اجمع المسلمون علیه ..... ومنها قوله من قریش قال النبی ﷺ : الائمة من قریش۔(۳)

خلیفہ کے لیے شرط ہے کہ وہ عقلمند ،بالغ ، آزاد ، مذکر ، بہادر ، ذی رائے ، سننے والا ، دیکھنے والا اور بولنے والا ہو، ان لوگوں میں سے ہو جس کی اور جس کی قوم کی بزرگی لوگوں نے تسلیم کر رکھی ہو اور لوگ اس کی اطاعت کرنے سے نفرت نہ کرتے ہوں۔اس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ نظام حکومت میں حق کی پیروی کرے گا اور ان سب باتوں پر عقل دلالت کرتی ہے۔اور ان باتوں کے شرط ہونے پر انسانوں کے تمام گروہوں نے اتفاق کیا ہے۔باوجود اس کے کہ ان کے ملک ایک دوسرے سے دور اور ان کے مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اس لیے کہ انہوں نے یہ دیکھا کہ خلیفہ مقرر کرنے میں جو مصلحت مقصود ہے وہ ان چیزوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ۔اور جب حکومت کی سربراہی ان اوصاف کو رائیگاں کر کے کسی کے سپرد کی جائے تو لوگ اس کو نامناسب سمجھتے ہیں اور اس چیز کو لوگوں کے دل نا پسند کرتے ہیں اور وہ غصہ سے خاموش ہو جاتے ہیں۔نبی ﷺ کا ایران والوں کے بارے میں ارشاد ہے: جب انہوں نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنا لیا : ہرگز فلاح نہیں پائے گی وہ قوم جس نے اپنے معاملے کا ذمہ دار عورت کو بنا لیا۔اور ملت مصطفویہ نے خلافت نبوت

کے لیے چند اور باتوں کا بھی لحاظ کیا ہے۔ جن میں اسلام، علم اور عدالت شامل ہیں اور یہ اوصاف اس لیے بڑھائے ہیں کہ ملی مصلحتیں بالبداہت ان اوصاف کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہو سکتیں۔ لہذا مسلمانوں نے ان پر اتفاق کیا ہے۔ اور انہی شرائط و اوصاف میں خلیفہ کا قریش میں سے ہونا بھی ہے۔ اس بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا: آئمہ قریش میں سے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے ایک اور فاضل مصنف پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے خلافت کی دو اقسام بیان کرتے ہوئے ان کی شرائط اس طرح درج کی ہیں:

خلافت و ریاست از روئے اسلام دو قسم ہے۔ ایک خلافت عام جس کے لیے شرائط ذیل ہیں: مسلمان ہونا، عاقل ہونا، بالغ ہونا، حر (آزاد) ہونا، سمع و بصر و کلام میں بے عیب ہونا، کافی یعنی امور خلافت کے سرانجام دینے میں پورا ہونا، مجتہد ہونا گو مستقل نہ ہو منتسب ہی سہی، عادل ہونا، قریشی ہونا اور (اختلافی شرط) کاتب ہونا۔

دوسری خلافت خلافت خاص ہے۔ اس کی شرائط میں علاوہ امور مذکورہ بالا وہ اوصاف بھی ہیں جن کی تصریح قرآن مجید میں موجود ہے..... خلافت خاصہ راشدہ کے اوصاف مختصراً یہ ہیں: ۱۔ خلیفہ مہاجرین اولین میں سے ہو۔ ۲۔ خلیفہ کا مشاہد خیر مثل بدر و حدیبیہ وغیرھما کے حاضرین میں سے ہونا۔ ۳۔ حسن عبادت الٰہیہ۔ ۴۔ حسن معاملات با خلق سے مزین ہونا۔ ۵۔ جہاد اعداء اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ میں آنحضرت ﷺ کی عیانت کرنا۔ اور ۶۔ متمم افعال و موعودات نبویہ ﷺ (مثل ختم ہو جانے ملت قیصر و کسریٰ و فتح بلدان و نشر علم) کا ہونا بھی شامل ہے۔ (۱)

شیعہ کے نزدیک والی کے لیے ان آٹھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے: ۱۔عقل وافی، ۲۔اسلام و ایمان، ۳۔عدالت، ۴۔فقاہت، ۵۔قوت اور حسن ولایت، ۶۔بخل اور حرص وطمع نہ رکھے، ۷۔مرد ہو، ۸۔حلال زادہ ہو۔(۱)

یہ شروط جنہیں علمائے اسلام نے خلافت عامہ کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ان سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ خلیفہ ایک ممتاز فرد ہونا چاہیے۔اور اسلام کی نظریاتی ریاست کا سربراہ اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ ہو۔وہ نہ صرف دینی فکر و کردار کے حوالے سے نمایاں شخص ہو بلکہ اسے عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے فہم وادراک کی حامل شخصیت ہونا چاہیے۔

۳۔ سربراہ اسلامی حکومت کے فرائض واختیارات:

اسلامی حکومت کا سربراہ امت کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔اس لیے اس کے فرائض و اختیارات میں خدمت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔فقہاء کرام نے اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے امام کے فرائض و اختیارات کو چند اساسی امور میں محدود کیا ہے۔لیکن حالات و واقعات کی تبدیلیوں کے مطابق ممکن ہے کچھ اور اختصاصی امور بھی نمایاں ہو کر سامنے آجائیں تاہم فقہاء اسلام نے بنیادی امور کی نشاندہی ضرور کردی ہے:

> والمسلمون لا بد لهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم واقامة حدودهم وسد ثغورهم و تجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار وصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم ونحو ذلك من امور التى لا يتولاها احاد الامة۔(۲)

اور مسلمانوں کو ایسا امام مقرر کرنا ضروری ہے جو اسلام کے احکام کی

تنفیذ کر سکے مثلاً حدود قائم کرنا، ملکی سرحدوں کی حفاظت، اسلامی لشکر کی تشکیل و ترتیب کرنا، صدقات کی وصولی کا اہتمام، باغیوں۔ چوروں اور ڈاکوؤں کو مغلوب کرنا، جمع اور عیدوں کا قیام، لوگوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنا، حقوق پر قائم ہونے والی شہادتوں کو قبول کرنا، مالی لحاظ سے کمزور اور وہ صغار جن کے اولیاء نہ ہوں ان کا نکاح کرنا، مال غنیمت تقسیم کرنا اور اس طرح کے دیگر امور جن کا کوئی متولی نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلامی حکومت کے سربراہ کے فرائض کا ذکر خلافت کی تعریف میں ذکر کرتے ہوئے درج کیا ہے:

الخلافة هی الرئاسة العامة فی التصدی لاقامة الدین باحیاء العلوم الدینیة واقامة ارکان الاسلام، والقیام بالجهاد، وما یتعلق به من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتلة واعطاء هم من الفیء والقیام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم، والامر بالمعروف، والنهی عن المنکر، نیابة عن النبی ﷺ۔(۱)

خلافت عمومی سربراہی ہے اقامت دین کے لیے متوجہ ہونے میں، علوم دینیہ کو زندہ کرنے کے ذریعے سے اور ارکان اسلام کو قائم کر کے، جہاد کو قائم کر کے اور ان کاموں کے ذریعے جو جہاد سے تعلق رکھتے ہیں یعنی لشکروں کو تیار رکھنے، مجاہدین کے لیے وظائف مقرر کرنے، ان کو مال غنیمت میں سے دینے، خصومات میں فیصلوں کا اہتمام کرنے، حدود قائم کرنے، ظلم و زیادتی کو دور کرنے، اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے روکنے کے ذریعے نبی ﷺ کے نائب ہونے کی

حیثیت سے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کا بنیادی فرض منصبی اقامت دین اور نفاذ شریعت ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کے حقوق کا تحفظ ان کی فلاح و بہبود کی خاطر تدابیر اختیار کرنا بھی اس کی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔ اسلامی حکومت کے سربراہ کے جو فرائض گنوائے گئے ہیں (۲) وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ دین کی حفاظت اس کے اصول مستقرہ اور سلف کے اجماع کے مطابق کرنا

۲۔ قوانین شرعیہ کی تنفیذ اور عدل و انصاف کا قیام۔

۳۔ امن و امان کے قیام کو یقینی بنانا تاکہ لوگوں کی جان، مال اور آبرو محفوظ رہ سکے۔

۴۔ شرعی سزاؤں کے ضمن میں حدود شرعیہ کو قائم کرے تاکہ مجرموں کی سرکوبی ہو سکے اور لوگوں کے حقوق تلف نہ ہوں۔

۵۔ سرحدوں کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرے تاکہ دشمن کو دراندازی کا موقع نہ ملے۔

۶۔ کفار کو اسلام کی دعوت دینا اور محاربین کفار سے جہاد کرنا تاکہ اسلام کے غلبہ و تفوق کو یقینی بنانا ممکن ہو۔

۷۔ خوف، جبر اور زیادتی کے بغیر احکام شرعیہ اور اجتہاد فقہی کے مطابق خراج و صدقات کی وصولیابی کرے۔

۸۔ تنخواہوں کا منصفانہ نظام اور بروقت ادائیگی کا انتظام کرنے کے علاوہ مستحقین کے لیے وظیفہ مقرر کرے۔

۹۔ قومی خزانے پر امانت دار عمال مقرر کرے۔

۱۰۔ امور سلطنت کی از خود نگرانی کرے اور عوامی معاملات سے براہ راست باخبر رہے۔

اسی طرح مالکی فقیہ امام قرافی کے مطابق اسلامی حکومت کے سربراہ کے پاس فیصلہ کرنے کا اختیار بھی ہوتا ہے اور فتوی دینے کا بھی۔اس کے علاوہ اس کے پاس بہت سے

ایسے اختیارات اور ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق افتاء اور قضاۃ سے نہیں ہوتا مثلاً افواج کی جمع و ترتیب، دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے سامان حرب کا انتظام و انصرام، مختلف مدات کے ٹیکسوں کو جمع کرنا اور پھر اس جمع شدہ رقم کو صحیح اور ضروری مصارف پر خرچ کرنا، ریاست کے مختلف مقامات پر حکام اور نائبین کا تقرر، ریاست میں موجود شورش برپا کرنے والے باغیوں کا قلع قمع کرنا وغیرہ ایسے بہت سے امور ہیں جو صرف اسلامی حکومت کے سربراہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔(۱)

شریعت اسلامیہ نے سربراہ اسلامی حکومت کے فرائض کو پورے شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اگر ان فرائض کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ دین کی نگہبانی اور امور سیاست میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت کرے۔(۲) ان دونوں جامع فرائض کے عوض میں اس کا یہ حق ہے کہ لوگ اس کی سمع و طاعت کریں اور یہیں سے امام کے اختیارات کا دائرہ بننا شروع ہوتا ہے۔ فقہاء کرام کی نظر میں امامت یا خلافت ایک ایسا معاہدہ ہے جو باہمی رضا اور اختیار سے طے پاتا ہے۔(۳) اس لیے اب امام کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو امت نے اپنی مرضی سے اس کے سپرد کیے ہیں۔ امت کی رائے عامہ خدا کے اقتدار اعلیٰ کی نمائندہ ہے اور امام، امت کے قدرت و اختیار کا مرکز و محور ہے۔(۴) امام پر لازم ہے کہ وہ تمام داخلی اور خارجی مسائل کو امت مسلمہ کی اجتماعی مصلحت و مفاد کے تناظر میں حل کرے اور یہ تمام کام ان حدود کے اندر محدود رہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرما رکھی ہیں۔ گویا امام کے اختیارات غیر محدود نہیں ہیں اور نہ ہی اسے اسلامی حدود سے باہر نکلنے کی کوئی استثناء حاصل ہے۔ شریعت میں امام کے لیے بھی وہی امور جائز ہیں جو امت کے ہر فرد کے لیے جائز ہیں اور وہ تمام اس کے لیے بھی ممنوع ہیں جو امت کے ہر فرد کے لیے ممنوع ہیں۔ بلکہ ایک شرط یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حکمران اپنے آپ کو رعایا میں سے ایک عام شخص کی مانند تصور کریں۔(۵)

اسلامی قانون میں امام کے فرائض و اختیارات کے حوالے سے تنفیذ امر پہلا درجہ ہے۔اس تنفیذی اختیار میں وہ قوانین و احکام کا اجرا کر سکتا ہے اور اس کام کے لیے قواعد و ضوابط بنا سکتا ہے۔عمال کے نصب و عزل کا اختیار بھی اسے اسی ذیل میں حاصل ہے۔اس کے ساتھ احتساب و مواخذہ اور حکام کی کارگزاریوں کی تفتیش وغیرہ کا اختیار بھی اسے حاصل ہوتا ہے۔حفاظت دین کا فریضہ بھی امام کے ذمہ ہے اس لیے اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسی تدابیر اختیار کرے جو دین کی قوت کو کمزور نہ ہونے دیں۔امام کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ شوریٰ کے مطابق حکومت کرے اور اسلامی حکومت کے شورائی نظام کو بہر حال قائم رکھے۔کیونکہ شوریٰ، اسلامی حکومت کا ایک اہم عنصر ہے۔تاہم شوریٰ کی تجاویز اور منظور شدہ قانون کے نفاذ کا اختیار امام ہی کو حاصل ہے۔امت کے اجتماعی نظم کو قائم رکھنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے اور اس کے لیے تمام سطح کے سیاسی انتظام کا اسے اختیار حاصل ہے۔اس کے لیے اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کی خدمت کو اعلیٰ عبادات میں سے سمجھے اور شرعی حکم میں نرمی سے بات کہے اور بلاوجہ سختی نہ کرے۔احکام الٰہی کے اجراء و نفاذ میں سستی اور نرمی نہ کرے۔نیک طینت اور دین داروں کا احترام کرے۔تکبر اور جبر و سختی سے لوگوں کو متوحش کرنے کی بجائے کمزوروں اور زیردستوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔فراست اور عقل مندی بھی حکومت کرنے کی ایک اہم شرط ہے۔اس لیے تمام امور پر غور و فکر کرے اور فہم و عقل کی بارگاہ میں ہر حکم کی حقیقت، اس کے لوازم، لواحق اور عوارض کو دقت نظر سے دیکھے۔تاکہ کہیں لوگوں کی کسی مصلحت کو نقصان نہ پہنچے۔(۱) اسلامی حکومت کے سربراہ کے منصب کا تقاضا ہے کہ وہ اپنا ہر اختیار ایک فرض سمجھ کر استعمال کرے۔اور یہ احساس ہر صورت میں اس کے پیش نظر رہنا چاہیے کہ وہ من جانب اللہ عوام کی خدمت پر مامور ہے۔

۴۔ انتہائے ولایت حاکم:

اسلامی حکومت کے سربراہ کی ولایت درج ذیل تین طریقوں سے ختم ہو سکتی ہے۔

۱۔ **موت:** یہ وہ طبعی امر ہے جو زول ولایت کا سبب بنتا ہے اس لیے کہ خلافت کی مدت خلیفہ کی زندگی سے وابستہ ہے اور نصوص شرعیہ میں سربراہ حکومت کی کوئی مدت بیان نہیں کی گئی بلکہ اس کی سربراہی کو اس کی زندگی کے ساتھ دائمی متصور کیا گیا ہے۔ صحابہ کرام کا اجماع اس بات پر دلیل ہے کہ تمام خلفاء راشدین کی مدت خلافت کا کوئی خاص تعین نہ کیا گیا تھا۔ تاہم کسی زمانی مدت کا تقرر اسلامی نظام کی روح کے منافی بھی نہیں ہے:

> ویری الدکتور السنهوری ان روح النظام الاسلامی لا تتنافی اطلاقا مع توقیت الخلافة لمدة زمنیة محدودة،اذا ما تضمن عقدالخلافة ذلك۔(۲)
>
> دکتور سنہوری کے مطابق اسلامی نظام کی روح اس کے اطلاق کی منافی نہیں ہے کہ خلافت کی ایک زمانی مدت مقرر ہو جب کہ یہ بات عقد خلافت میں شامل ہو۔

۲۔ **منصب خلافت سے ازخود علیحدگی:** خلیفہ کا یہ ذاتی حق ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کے معاملات اور مصروفیات کے پیش نظر منصب خلافت سے ازخود دستبردار ہو جائے۔ اور اسے اس عہدے پر کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ابتداء میں یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہذا وہ اگر چاہے تو منصب خلافت سے از خود علیحدہ ہوسکتا ہے۔ امام ماوردی نے اس حوالہ سے تحریر کیا ہے:

> واذا خلع الخلیفة نفسه انتقلت الی ولی عهده، و قام خلعه مقام موته۔(۳)
>
> اور جب خلیفہ از خود منصب خلافت سے الگ ہو جائے تو خلافت اس کے ولی عہد کو منتقل ہو جائے گی اور یہ علیحدگی بمنزلہ موت کے سمجھی جائے گی۔

۳۔ **معزولی بوجہ تغیر حال:** منصب خلافت یا امامت پر متمکن شخص کو دو وجوہ کی بناء پر معزول کیا جاسکتا ہے۔(الف) اگر شرط عدالت میں تبدیلی آجائے۔(ب) نقص بدن واقع ہو جائے۔

جہاں تک شرط عدالت میں تبدیلی کا مفہوم ہے تو وہ فسق سے عبارت ہے اور فسق محظورات و منکرات شرعیہ کا ارتکاب اور شہوات و ہوائے نفسانیہ کی مغلوبی کا نام ہے۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ۔(۱)

اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجا لایا۔اللہ نے فرمایا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔عرض کی میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک۔☆

اس آیت قرآنی کے تحت علمائے اسلام نے تصریح کی ہے کہ ظالم و جابر اور فاسق و فاجر، امامت و خلافت کے اہل نہیں ہو سکتے اس لیے ایسے لوگوں کی امامت باطل ہے اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت لازم نہیں:

ان الامام یکون اھل العدل والاحسان و فضل مع القوۃ علی القیام بذلك وھو الذی امر النبی ﷺ الا ینازعو الامر اھلہ اما اھل الفسوق والجور فلیسوا لہ باھل۔(۲)

بے شک امام وہ ہوسکتا ہے جو عدل، احسان اور فضل جیسی صفات سے متصف ہو اور اس کے ساتھ اس میں حکومت کی ذمہ داریوں کو بجا

لانے کی قوت بھی ہو اور ایسے صاحب امر کے حوالے سے حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس سے مت جھگڑو! لیکن جو فاسق و فاجر ہوں وہ امامت وخلافت کے اہل نہیں۔

اسی طرح متذکرہ آیت کی ایک اور تفسیر میں تحریر کیا گیا ہے:

فثبت بدلالة هذه الآية بطلان امامة الفاسق وانه لا يكون خليفة وان من نصب نفسه فی هذاالمنصب وهو فاسق لم يلزم الناس اتباعه ولا طاعته۔(۳)

پس اس آیت کی دلالت سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے اور بلاشبہ وہ خلیفہ نہیں ہوسکتا اور اگر وہ خود کو اس منصب پر فائز کر لے اور وہ فاسق ہو تو لوگوں پر اس کی اتباع واطاعت لازم نہیں۔

متذکرہ تصریحات سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ فاسق و فاجر اور ظالم و جابر شخص کی اطاعت لازم نہیں اور ایسا شخص منصب خلافت و امامت کے اہل بھی نہیں اور اس کی امامت باطل ہے لیکن ایک ایسا شخص جس کا فسق و فجور امامت وخلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد ظاہر ہوا ہو تو اس کی حکومت کا کیا حکم ہے؟ اس سوال کا جواب اس طرح تحریر کیا گیا ہے:

قال الجمهور من الفقهاء والمتكلمين الفاسق حال فسقه لا يجوز عندالامامة له واختلفوا فی ان الفسق الطارئ هل يبطل الامامة ام لا ؟واحتج الجمهور على ان الفاسق لا يصلح ان تعقد له الامامة بهذه الآية۔(۱)

فقہاء و متکلمین میں سے جمہور نے فرمایا کہ فاسق جو اپنے فسق کی حالت میں ہو اس کے لیے امامت کا انعقاد جائز نہیں اور انہوں نے اس فسق کے بارے میں جو بعد میں امام پر طاری ہو اختلاف کیا ہے کہ وہ اس

کی امامت کو باطل کرتا ہے یا نہیں ۔جمہور نے اس آیت سے یہی استدلال کیا ہے کہ بے شک فاسق اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ اس کے لیے امامت کا انعقاد ہو۔

دیگر فقہائے کرام کی طرح امام ابوحنیفہ بھی خلیفہ کے لیے عادل ہونا ضروری خیال کرتے ہیں:

ولا فرق عند ابی حنیفة بین القاضی والخلیفه فی ان شرط کل واحد منهم العدالة وان الفاسق لایکون خلیفة ولا یکون حاکما کما لا تقبل شهادته و خبره۔(۲)

امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی اور خلیفہ کے مابین کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کے لیے ہی عدالت شرط ہے اور فاسق نہ خلیفہ ہوسکتا ہے اور نہ حاکم۔جیسا کہ اس کی شہادت اور روایت کو قبول نہیں کیا جاتا۔

امام ابوحنیفہ سب سے پہلے امامت کے منصب پر فائز شخص کی اصلاح کے قائل ہیں اور اگر اصلاح ممکن نہ ہو تو اس کے خلاف راست اقدام تک کی اجازت دیتے ہیں ۔اس بابت امام ابوحنیفہ کا موقف اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وکان من قوله وجوب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر فرض بالقول فان لم یوتمر فبالسیف۔(۱)

امام ابوحنیفہ کا ایک قول یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبان سے فرض ہے اور اگر وہ نیکی کا یہ حکم نہ مانے تو امر بالمعروف تلوار سے واجب ہے۔

اور امام شافعی فسق کی وجہ سے معزولی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ان کو موقف ہے کہ:

ان الامام ینعزل بالفسق والجور وکذا کل قاض و امیر واصل المسئلة أ ن الفاسق لیس من اهل الولایة عندالشافعی لانه لا ینظرلنفسه فکیف ینظرلغیره۔(۲)

بے شک امام، فسق کی وجہ سے معزول ہو جاتا ہے (خود بخود) اور ایسے ہی ہر قاضی اور امیر بھی اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ فاسق، ولایت کے اہل ہی نہیں ہے امام شافعی کے نزدیک۔ اس لیے کہ جو اپنا خیال نہیں رکھ سکتا وہ کسی دوسرے کی نگرانی کیسے کرے گا۔

لیکن اگر وہ شخص جو منصب امامت پر فائز ہے اور اس کا فسق ظاہر ہو چکا ہے جو باوجود اس کے کہ منصب امامت کے اہل نہیں رہا مگر اس منصب کے ساتھ چمٹا ہوا ہے تو اس کے لیے طریقہ کار یہ ہے کہ اسے ججوں کی ایک کمیٹی (لارجر بینچ) سے شرعی حکم صادر ہونے کے بعد معزول کیا جائے گا۔ کیونکہ جج ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سربراہ حکومت، شریعت کے مطابق عمل پیرا ہے یا اس کے خلاف کر رہا ہے۔ اور پھر اس کا معزول کیا جانا واجب ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس صورت حال میں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مستحق عزل فاسق شخص باوجود عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے امامت کا منصب نہیں چھوڑتا اور عدالت کا فیصلہ تسلیم نہیں کرتا تو اب مسلمان اس کی بیعت سے آزاد ہیں اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے خلاف خروج کرتے ہوئے اسے معزول کر دیں۔ (۳) کیونکہ ایسا شخص نہ صرف فاسق ہے بلکہ فسق پر قائم رہنے کا مصمم عزم رکھنے کی بناء پر اللہ کی حدود کا باغی ہو چکا ہے لھذا کسی طرح منصب امامت اس کے سپرد نہیں رہ سکتی اور وہ نہ صرف مستحق عزل ہے بلکہ اسے معزول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

پس خلیفہ یا امام میں ان دو باتوں میں سے اگر ایک بھی پیدا ہو جائے تو وہ امامت سے خارج اور معزول ہو جاتا ہے۔ پہلی بات شرط عدالت میں خرابی اور دوسری بدن میں کسی نقص کا پیدا ہو جانا۔ نقص بدن میں تین چیزیں ہیں: ایک نقص حواس، دوسرا نقص اعضاء اور تیسرا نقص تصرف۔ نقص حواس میں زوال عقل یا زوال بصارت وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ نقص اعضاء کی مثال دونوں ہاتھوں یا دونوں پاؤں کا نہ ہونا وغیرہ اور تیسرے نقص میں فرائض کی بجا آوری کا نقص شامل ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک اعتزال اور دوسرا قید۔ اعتزال سے مراد

یہ ہے کہ امام کے مشیروں اور اموال میں سے کوئی شخص اتنا حاوی ہو جائے کہ وہ بجائے امام کے خود ہی احکام نافذ کرنے لگے۔ اگر اس کے احکام متقاضائے شریعت و عدل کے خلاف ہوں اور امام اس پر خاموش رہے تو امام مستحق عزل ہے۔ جب کہ دوسرے نقص یعنی قید کی وضاحت یوں ہے کہ امام اگر کسی طاقت ور دشمن کے ہاتھ میں قید ہو جائے اور اس کی رہائی ممکن نہ ہو بلکہ باوجود کوشش کے مایوسی ہو چکی ہو تو وہ امامت سے خارج ہو جائے گا اور ارباب حل وعقد کے لیے یہ جائز ہوگا کہ وہ کسی اور کو امام بنالیں۔(۱)

۵۔ مجلس شوریٰ:

حضور علیہ الصلوۃ والسلام اپنی حیات طیبہ میں صحابہ کرام سے مشاورت کرتے رہے۔ ہجرت سے قبل کی مکی زندگی میں آپ کی مجلس شوریٰ کے اراکین دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ صحابہ جو سابقین اولین تھے۔ دوسرے وہ اصحاب جو مختلف مواقع پر اپنی فہم وفراست کی بناء پر اسلامی جماعت میں ممتاز ہو چکے تھے۔ آپ ﷺ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر جس وقت ۷۲ آدمی بیک وقت مسلمان ہوئے تو ان کی تنظیم اور مرکزیت کو ضروری خیال کرتے ہوئے ان بیعت کرنے والے افراد سے فرمایا: اپنے میں سے بارہ نمائندے منتخب کر لو اس پر انہوں نے قبیلہ خزرج میں سے نو اور قبیلہ اوس میں سے تین نمائندوں کو منتخب کیا۔ آپ ﷺ نے انصار مدینہ کے بارہ نقیب مقرر فرما کر ان سے بیعت لی اور ان بارہ میں سے ایک ابو امامہ سعد ابن زرارہ کو نقیب النقباء مقرر کیا۔(۲) اس طرح رسالت مآب ﷺ نے تنوع میں وحدت اور افراتفری کی بجائے یکجہتی کے لیے قوم کے معتمد نمائندوں پر مشتمل مجلس شوریٰ قائم کر دی اور پھر ہجرت مدینہ کے بعد انصار کا عنصر بھی آپ کی مجلس شوریٰ میں باقاعدہ طور پر شامل رہا اسی طرح مدینہ کی اسلامی ریاست جب آپ کی اقتداء میں قائم ہوئی تو اس معاشرے میں ایک تو وہ لوگ جنہوں نے مختلف مواقع پر کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اور دوسرے وہ جنہوں نے دین میں فقاہت کے حوالے سے اپنے ذہن رسا کا ثبوت فراہم کیا تھا دونوں طرح

کے لوگ آپ کی مجلس شوریٰ میں شامل ہو گئے۔ آپ کی مشاورت کے لیے چودہ حضرات منتخب تھے اور یہ سب اپنی قوم کے سربراہ تھے۔ ان میں سے سات انصار میں سے اور سات مہاجرین میں سے تھے ہر ایک اپنی قوم اور جماعت کا نمائندہ تھا اور اپنی قوم کے اسلام لانے کا ذمہ دار تھا۔ یہی افراد وہ مجلس شوریٰ تھی جس کے اراکین سے رسول اللہ ﷺ مشورہ فرماتے تھے۔ سید مودودی کا موقف ہے:

> اس طرح نبی ﷺ ہی کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ بن چکی تھی جو بعد کو خلفائے راشدین کی مشیر قرار پائی۔ اور وہ دستوری روایات بھی مستحکم ہو چکی تھیں جن کے مطابق آگے چل کر ایسے نئے لوگ اس مجلس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ (۳)

خلفائے راشدین کا تعامل بھی یہی تھا کہ قومی اہمیت کے امور اور قانون سازی کے لیے انہوں نے مجلس شوریٰ قائم کر رکھی تھی اور اہم امور میں اس سے مشاورت ضرور کی جاتی تھی۔ جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے:

> و کانت الآئمة بعد النبی یستشیرون الامناء من اهل العلم فی الامور المباحة لیاخذوا باسهلها۔ (٤)
>
> نبی ﷺ کے بعد خلفائے راشدین (آئمہ) صاحبان علم میں سے امین لوگوں سے مباح امور میں مشاورت کرتے تا کہ آسان ترین کو اختیار کر سکیں۔

اسلامی لٹریچر کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مجلس شوریٰ کے ارکان کو العرفاء، النقباء، ملاء القوم، اولی الامر اور اہل الحل والعقد وغیرہ کی اصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہی کے ذریعے اسلامی حکومت کے سربراہ کا چناؤ کیا جاتا ہے اور یہ لوگ امت کی نیابت میں اس اہم فریضہ کو انجام دیتے ہیں:

وان لم يقم بها (أ ى الامامة)أحد،خرج من الناس فريقان:أحدهما ـ أهل الاختيار،حتى يختاروا إماما للأمة ـ والثانى ـ أهل الامامة حتى ينتصب أحدهم للإمامة ، وليس على من عدا هذين الفريقين من الأمة فى تأخير الإمامة حرج ولا مأثم۔(۱)

اور اگر کوئی شخص اس (امامت کی) ذمہ داری کو لینے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اب لازمی طور پر جمہور میں سے دو قسم کے لوگ ہونگے ۔ایک اہل اختیار جو کسی کو امت کے لیے امام منتخب کریں۔دوسرے اہل امامت کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی اس منصب کے لیے خود کو پیش کرے۔ان کے علاوہ باقی قوم کے افراد پر امامت کے انعقاد کی تاخیر میں کوئی الزام نہیں۔

۶۔ رکن شوریٰ کی شروط اہلیت:

امام ماوردی نے مجلس شوریٰ کے اراکین کی درج ذیل شروط اہلیت (۲) کا ذکر کیا ہے:

۱۔ عدالت کی تمام شروط کا جامع ہونا۔یعنی اسے صاحب تقویٰ ہونا چاہیے ۔ارکان شوریٰ کو چونکہ امناء اور خیار الناس کہا گیا ہے اس لیے یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ کبائر وفواحش سے اجتناب کرتے ہوں اور مأمورات شرعیہ کو بجالانے والے ہوں۔

۲۔ دوسری شرط علم ہے جس سے وہ یہ معلوم کرسکیں کہ کون شخص امامت کی شرائط کا حامل ہے۔اور بوقت ضرورت اجتہادی بصیرت کا مظاہرہ کر سکے گا۔حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ میں ذی علم لوگ شامل تھے جس کا ذکر امام بخاری نے اس طرح کیا ہے:

كان القراء أصحاب مجالس عمر و مشاورته كهولاء كانوا أو شبانا۔(۳)

حضرت عمر کی مجالس مشاورت میں ذی علم شامل تھے چاہے وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان۔

۳۔ فکر و دانائی بھی اہل حل وعقد کی ایک اہم شرط ہے تا کہ معاملہ فہمی میں مدد مل سکے او رامامت کے لیے بہترین آدمی کے انتخاب میں معاونت ہو سکے اور اسی شرط کی وجہ سے لوگوں کے لیے زیادہ قوی اور زیادہ معروف مصالح کو اختیار کیے جانے میں سہولت میسر آتی ہے۔

متذکرہ شرائط سے پتہ چلتا ہے کہ علمائے اسلام نے مجلس شوریٰ کو صرف مجتہدین تک ہی محدود نہیں کیا اس لیے کہ اگر مجلس شوریٰ کے اراکین درجہ اجتہاد کے لوگ ہوں تو یہ سب سے اولی صورت حال ہے ورنہ دوسرے صاحبان علم اور ذی فہم لوگوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے:

> یلاحظ ان اهل حل والعقد فی السیاسة لا یقتصر علی (المجتهدین) الذی یتولون مهمة استنباط احکام الشرعیة من مصادرها،وانما یشمل فئات اخریٰ لها میزاتها فی المجتمع۔(۱)
>
> ملاحظہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد صرف ان لوگوں (مجتہدین) تک محدود نہیں ہے جو شریعت کے مصادر سے استنباط احکام کرتے ہیں بلکہ اس میں وہ دوسرے گروہ بھی شامل ہیں جن کا معاشرے میں کوئی کردار یا مقام ہے۔

رہی غیر مسلم کی بات تو وہ بھی مجلس شوریٰ کا رکن ہو سکتا ہے۔ وہ مصلحت عامہ اور انتظامی امور میں مشاورت دے سکتا ہے۔اور غیر مسلم پرسنل لاء کے دائرہ میں قانون سازی کے لیے سفارشات بھی اس کے ذریعے مرتب کی جا سکتی ہیں۔البتہ شرعی امور اور سربراہ حکومت کے انتخاب میں اس سے مشاورت درست نہیں ہوگی۔اسی طرح مجلس شوریٰ میں خواتین کو بھی نمائندگی دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر یہ ادارہ مشاورت اور قانون سازی ہی

کرتا ہو۔اور اگر یہ ادارہ امور حکومت میں دخیل ہو تو بعض علماء خواتین کی نمائندگی کو اس کے لیے مناسب خیال نہیں کرتے۔(۲)

۷۔ مجلس شوریٰ کا دائرہ عمل:

حضور رسالتمآب ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں بار بار مشاورت کی اہمیت پر زور دیا اور ہر معاملہ میں اس کی ترغیب دی۔نہ صرف یہ بلکہ جس سے مشورہ لیا جائے اس کی ذمہ داری تک کو بھی اجاگر فرمایا۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے؛

المستشار مؤتمن۔(۳)

جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ معتمد (امانت دار) ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین خلافت کے اہم امور میں مشاورت کو ضروری خیال کرتے تھے اور حضرت عمر کا یہ قول تو بہت مشہور ہے۔

لا خلافة الا عن مشورة۔(۱)

خلافت وحکومت مشورہ کے بغیر (قائم) نہیں ہوتی۔

یہ وہ بنیادی ضابطہ ہے جس کے خلاف خلفائے راشدین کے عہد میں کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور اس ضابطے کو قانونی حیثیت مل گئی۔یہ ضابطہ مجلس شوریٰ کا پہلا دائرہ عمل متعین کرتا ہے کہ مجلس شوریٰ کے ذریعہ سربراہ حکومت کا تقرر ہوتا ہے اور اس کے برعکس اگر کسی طرح سربراہ حکومت کی تقرری عمل میں لائی جائے تو وہ غیر قانونی اور کالعدم متصور ہوگی۔اسی تناظر میں امام ماوردی نے تحریر کیا ہے:

فاذا اجتمع اهل العقد والحل للاختيار،تصفحوا أحوال أهل الإ مامة الموجودة فيهم شروطها، فقدموا للبيعة منهم أكثرهم فضلاً، وأكملهم شروطاً ومن يسرع الناس إلى طاعته ، ولا يتوقفون عن بيعته۔(۲)

پس جب اہل حل وعقد (اراکین مجلس شوریٰ) جمع ہوجائیں تو منصب

امامت کے لیے موزوں افراد کے احوال کا جائزہ لیں جن میں شرائط اہلیت موجود ہوں پھر بیعت کے لیے اسے آگے لائیں جو ان میں سے زیادہ صاحب فضل، شروط میں زیادہ کامل اور جسکی اطاعت پر لوگ جلد تیار ہوسکیں تو ایسے شخص کی بیعت میں توقف نہیں کرنا چاہیے۔

مجلس شوریٰ کے اراکین کی مشکل مہم کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر امامت کی تمام شروط دو افراد میں مساوی طور پر موجود ہوں تو ایسی صورت میں زیادہ عمر کے شخص کو سربراہ حکومت کے تقرر کے لیے ترجیح دی جائے گی اگرچہ زیادتی عمر امامت کی شروط میں نہیں ہے۔ اگر اہل حل و اختیار کسی مخصوص صورتحال میں کسی کمسن کے ہاتھ پر بھی بیعت کر لیں تو وہ بھی جائز ہوگی اور اگر دو اشخاص میں ایک زیادہ عالم اور دوسرا زیادہ شجاع ہو تو اس صورت میں ضرورت وقتی کا لحاظ کیا جائے گا اگر اہل اختیار نے کسی ایک شخص کو جو ان کے نزدیک تمام افراد ملت اسلامیہ میں بہترین تھا امام بنالیا اور اس کی بیعت کے بعد ایک اور شخص ایسا سامنے آگیا جو اس سے بھی بڑھ کر ہے تو ایسی صورت میں جس شخص کے لیے انہوں نے بیعت کر لی ہوگی وہی نافذ رہے گی۔(۳)

اس بحث سے درج ذیل نتائج نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ مجلس شوریٰ کا اہم ترین کام سربراہ حکومت کے لیے پوری بحث و تمحیص اور تحقیق و تفتیش کے بعد اہل ترین افراد کے نام تجویز کرنا ہے۔

۲۔ مجلس شوریٰ نہ صرف صاحبان علم و فضل اور امامت کے لیے شروط کے جامع افراد کے احوال کو زیر غور لائے گی بلکہ اس کے لیے وقت کی نزاکتوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

۳۔ مجلس شوریٰ کے اراکین اگر ایک دفعہ کسی شخص پر متفق ہو کر بطور امام اس کی بیعت کر لیں تو یہ انکی بیعت ایک قانونی اثر رکھتی ہے۔

اسلامی حکومت کے سربراہ کا انتخاب و تقرر اگرچہ ایک اہم ترین کام ہے لیکن کیا اس کام کے بعد مجلس شوریٰ کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور پھر اس کا کوئی کام باقی نہیں رہتا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے اس لیے کہ مجلس شوریٰ دراصل سربراہ حکومت کو قانون سازی کے امور میں مشاورت فراہم کرنے والا مستقل ادارہ ہے اور اہم امور میں مشاورت فراہم کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی قانون سازی کے لیے تجاویز پیش کرنا مجلس شوریٰ کی ذمہ داریوں میں اولیت رکھتی ہے۔ لہذا مجلس عاملہ جو قوانین مرتب کرے انہیں مطالعہ کے لیے مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کیا جائے جس مسئلہ کے متعلق کوئی حکم تجویز کیا گیا ہو اس کا مطالعہ کر کے مجلس شوریٰ اپنی رائے دے شرعی حکم کے مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ ارکان مجلس شوریٰ دو زاویوں سے عملی مسائل کا جائزہ لیں گے۔ ان میں سے پہلی چیز شرعی نص ہے۔ کتاب و سنت کی نصوص مجلس عاملہ کی رائے کی تائید کریں گی یا تردید دوسری چیز یہ ہے کہ اس واقعہ کی حقیقت کو سمجھا جائے تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کیا جاسکے۔ واقعہ کو سمجھے بغیر اس پر جس شرعی حکم کا اطلاق کیا جائے گا وہ درست نہیں ہوگا کیونکہ اس واقعہ کے بارے میں شرعی حکم کو سمجھنے کا انحصار اس واقعہ کے سمجھنے اور اس کی حقیقت کے ادراک پر ہے۔ اسلیے درپیش مسئلہ کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ادلہ شرعیہ سے حکم شرعیہ کا استنباط کرنا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں حکومتی سطح پر جتنی بھی قانون سازی کی گئی اس میں مجلس شوریٰ کی مشاورت کا کردار نہایت نمایاں نظر آتا ہے۔ امام بخاری نے مجلس شوریٰ کے بارے میں خلفائے راشدین کا طرز عمل ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد تمام خلفائے راشدین صاحبان علم کی مجلس شوری سے مباح امور میں مشاورت کرتے تھے تاکہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر آسان ترین امر کو اختیار کر سکیں۔(۱) اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ عہد خلفائے راشدین میں امین اور اہل علم لوگوں پر مشتمل مجلس شوریٰ ہوتی تھی حضرت ابوبکر کے بارے میں مجلس شوریٰ سے رائے طلب کرنے کی روایت سنن

دارمی میں اس طرح درج ہے:

فان اعیاہ (ای ابا بکر)ان یجد فیہ سنۃ من رسول اللّٰہ جمع رؤس الناس و خیارھم فاستشارھم فاذا اجتمع رأیھم علی امر قضٰی بہ۔(۲)

اگر حضرت ابوبکرؓ سنت رسول ﷺ کو تلاش کرنے میں عاجز آجاتے تو لوگوں سے سربراہوں اور ان میں سے بہترین لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشاورت کرتے تو جس بات پر وہ متفق ہو جاتے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔

گویا مجلس شوریٰ کا ایک مستقل اہم کام اسلامی قانون سازی کرنا ہے اس پر خلفائے راشدین اور ان کی مجلس شوریٰ کا تعامل اہم ترین دلیل ہے۔ الغرض اسلام کے شورائی نظام میں مجلس شوریٰ کے دائرہ عمل کو قانونی فوقیت حاصل ہے۔

مبحث سوم: اسلامی نظام حکومت کے اصول:

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی قیادت میں وجود میں آنے والا مسلم معاشرہ جب ہجرت کے بعد ایک اسلامی حکومت کی شکل اختیار کر گیا تو بطور ایک نظام حکومت کے اس میں وہ تمام خصاصیات موجود تھیں جو اسے کسی بھی دوسرے نظام حکومت سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ تمام خصوصیات دراصل وہ اصول ہیں جو آخری الہامی و آسمانی کتاب قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ پیغمبرانہ قیادت نے اپنے قول و عمل سے مدینہ کی اسلامی ریاست وحکومت میں ان اصولوں کی نہ صرف تعبیر وتشریح کر دی بلکہ انہیں عملی شکل میں نافذ کر دیا۔ اس لیے اب ہر ایک حکمران کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اسلامی نظام حکومت کے ان اصولوں کا التزام کرے جنہیں قرآن وسنت نے بیان کر رکھا ہے۔ ان اصول وضوابط پر زمان و مکان کی تبدیلیوں اور تغیرات کا اثر نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام حکومت کے وہ بنیادی اصول جن پر اس کی عمارت تعمیر

ہوتی ہے انہیں محققین اسلام جن میں امام ماوردی، شاہ ولی اللہ اور سید مودودی وغیرہ شامل ہیں نے نمایاں طور پر بیان کر رکھا ہے۔ اسلامی نظام حکومت کے چند نمایاں اصول حسب ذیل ہیں:

ا۔ حاکمیت اعلیٰ:

اسلام میں شارع یعنی واضع قانون کی حیثیت صرف اللہ رب العزت اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو حاصل ہے اللہ کی حاکمیت حقیقی اور اصلی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی حاکمیت نیابتی نوعیت کی ہے۔ اسلامی قانون نصوص قرآن سے تشکیل پائے یا سنت رسول ﷺ سے دونوں صورتوں میں اس کا ماخذ وحی خداوندی ہے۔ قرآن مجید وحی جلی سے عبارت ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو وحی خفی کی حیثیت حاصل ہے اجتہادی نوعیت کے تمام قوانین بھی قرآن وسنت کی تعلیمات پر ہی مبنی ہوتے ہیں اس لیے ان کا ماخذ بھی بالواسطہ وحی الٰہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں مطلق العنانی کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ ہر کام اور قانون وحی الٰہی کی ہدایات وتعلیمات کے مطابق کرنا ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔(۱)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذیشان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور (اپنے) رسول (کے فرمان) کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز قیامت پر یہی بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اس کا انجام۔☆

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔(۱)

اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔☆

اسلامی معاشرے میں قرآن و سنت کی بالا دستی کے حوالے سے نبی کریم ﷺ نے خود بھی متعدد مواقع پر اپنے ارشادات میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا:

فعلیکم بکتاب اللہ احلوا حلالہ و حرموا حرامہ۔(۲)

پس کتاب اللہ کی پیروی تم پر لازم ہے اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام جانو۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بھما: کتاب اللہ و سنۃ نبیہ۔(۳)

میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں، تم انہیں اگر تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے۔

ما امرتکم بہ فخذوہ وما نھیتکم عنہ فانتھوا۔(٤)

میں نے تمہیں جس چیز کا حکم دیا ہے اسے لے لو اور جس چیز سے میں نے تمہیں روکا ہے اس سے رک جاؤ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں وحی الٰہی کی بالا دستی کو تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ وحی کے ذریعے جو اسلامی قانون انسانیت کو عطا کیا گیا ہے وہ دائمی اور ابدی ہے اور آفاقی و عالمگیر بھی۔ اس لیے اس کے احکام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ظاہر اور باطن دونوں کو محیط ہیں۔ گویا وحی الٰہی کی بالادستی کا اصول اسلامی نظام حکومت کو دوسرے تمام نظام حکومت کے مقابلے میں اسے ایک تفرد و امتیاز سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہ اصول جہاں معاشرے میں

استقلال لاتا ہے وہاں اس بات کی بھی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ انسان کا وہ مستقبل جس میں وہ از خود جھانک نہیں سکتا وحی الٰہی کی روشنی میں اس کو بھی سنوارنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس لیے انسان کو اسلامی نظام حکومت پر یقین و اعتماد حاصل ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں قانون خداوندی کو بہر صورت بالادستی حاصل رہتی ہے۔ لہٰذا اسلام کے نظام حکومت میں حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ رب العزت کی ہی تسلیم شدہ ہے جو ایک بدیہی حقیقت ہے۔

۲۔ شوریٰ:

اسلام کا نظام حکومت دراصل نظام شوریٰ ہے۔ درج ذیل آیات قرآنی شوریٰ کے اصول کا اثبات کرتی ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔(۱)

اور صلاح مشورہ کیجیے ان سے اس کام میں۔☆

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔(۲)

اور ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔☆

رسالت مآب ﷺ کی قولی اور عملی سنت سے بھی اصول شوریٰ کے وجوب کی دلیل میسر آتی ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس کے بارے میں نصوص شریعت سے کوئی امر و نہی نہ ملے تو اس کے متعلق آپ کا ارشاد کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تجعلونه شورى بين اهل الفقه وا لعابد ين من المومنين ولا تقضى فيه برأى خاصة۔(۳)

اس بارے میں دین کی سمجھ رکھنے والے عبادت گزار لوگوں سے مشورہ کر لیا کرو اور کسی شخص کی انفرادی رائے اختیار نہ کر ڈالو۔

رسول اللہ ﷺ کے اپنے شورائی طرز عمل کے بارے میں حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں:

لم یکن احد اکثر مشورۃ لاصحابہ من رسول اللہ ۔(٤)

اپنے ساتھیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

غزوہ بدر کے موقع پر آپ نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ابو بکرؓ اور عمرؓ نے اپنی رائے دی مگر آپ انصار کی رائے لینے کے لیے خاموش رہے تو سعد بن عبادہ انصاریؓ نے کھڑے ہو کر کہا کہ اگر آپ ہمیں حکم دیں تو ہم دریا میں چھلانگ لگانے یا برک الغماد (یمن) تک اپنے گھوڑوں کو دوڑانے کے لیے بھی تیار ہیں۔اس پر آپ ﷺ نے روانگی کا حکم دیا اور فوج مقام بدر پر مورچہ زن ہوگئی۔(۵)اسی طرح معرکہ بدر کے بعد آپ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق بھی صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا اور حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان قیدیوں کو آزاد کر دیا(٦)اور غزوہ احد کے موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا اور شہر کے اندر مورچہ زن ہونے کی اپنی رائے کو چھوڑ کر نوجوانوں کی رائے کو قبول کرتے ہوئے مدینہ سے باہر نکل کر کوہ احد کے دامن میں جنگ کا محاذ قائم کیا(۷)تو گویا رسول اللہ ﷺ نے عملی طور پر شوریٰ کے اصول کو رائج فرمایا اس لیے اب کسی بھی حکمران کے لیے اس کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔یہی وجہ ہے کہ تمام خلفائے راشدین کے طرز عمل میں اس اصول شوریٰ سے بھرپور تمسک ملتا ہے۔امام بخاری نے لکھا ہے:

وکانت الآئمۃ بعد النبی ﷺ یستشیرون الامناء من اھل العلم فی الامور المباحۃ لیاخذوا باسھلھا فاذا وضح الکتاب او السنۃ لم یتعدوہ الی غیرہ اقتداء بالنبی ﷺ۔(۱)

نبی ﷺ کے بعد آئمہ یعنی خلفائے راشدین ان لوگوں سے مشورہ کرتے تھے جو اہل علم میں سے امانت دار ہوتے یہ مشاورت مباح امور میں ہوتی تھی تاکہ آسان ترین کو اختیار کیا جائے۔پس جب

قرآن وسنت کا کوئی واضح حکم مل جاتا تو یہ حضرات اس سے آگے نہ بڑھتے، ان کا یہ طرز عمل نبی ﷺ کی پیروی کی بناء پر تھا۔

اسلامی نظام حکومت کے لیے شوریٰ کے اصول پر عمل درآمد کی ناگزیریت کو حضرت عمر نے اس طرح بیان کیا ہے:

لا خلافة الا عن مشورة۔(۲)

مشورہ کے بغیر کوئی خلافت نہیں۔

شریعت اسلامیہ نے شوریٰ کے اصول کو مقرر کرنے کے بعد اس کی تنفیذ کے قواعد و ضوابط کو ارباب امر پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ یہ قواعد مقامات، حالات اور اوقات کے اختلافات کی وجہ سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ارباب حکومت ان قواعد وضوابط کو موقع ومحل کی مناسبت سے متعین بھی کر سکتے ہیں اور نافذ بھی۔ تاہم شوریٰ کے اصول سے مفر اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلیفہ کو شوریٰ کے فیصلے کا پابند بنا دیا گیا ہے یا وہ آزاد ہے چاہے تو شوریٰ کا فیصلہ تسلیم کرے اور چاہے تو اسے ویٹو کر دے؟ اس سوال کا جواب ہمیں خود خلیفہ کے انتخاب سے ہی مل جاتا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب کی اساس ہی شوریٰ پر رکھی گئی ہے اور اگر شوریٰ کے فیصلہ کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو اور اسے اعتماد و اختیار سے خالی کر دیا جائے تو خلافت کے لیے منتخب شخص پر سے بھی اعتماد جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن بات ہے کہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے تو شوریٰ کے فیصلے کو رد نہ کیا جاسکے اور انتخاب کے بعد خلیفہ ہی اس کے کسی فیصلہ کو ویٹو کر دے۔ دوسرا یہ کہ خلیفہ کی انفرادی رائے کے مقابلہ میں شوریٰ کے فیصلہ کی پابندی کرنا لازم ہے کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو فقہائے عابدین سے مشورہ لینے کا حکم دیا اور انفرادی رائے اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔ خلفائے راشدین کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ وہ شوریٰ کے فیصلوں کو نافذ کرتے تھے۔ ملوکیت اور خلافت کا بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ مشورہ تو بادشاہ بھی کرتے رہتے ہیں لیکن وہ ان مشوروں کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے جب کہ خلیفہ

شوریٰ کے فیصلے کو نافذ کرتا ہے اور اس کا پابند ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کی نوعیت اور اس مشاورت کے فیصلے پر عمل درآمد کے حوالے سے علماء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے:

> و غیر جائز ان یکون الامر بالمشاورۃ علی جھۃ تطیب نفوسھم ورفع اقدارھم ولتقتدی الامۃ بہ فی مثلہ لانہ لو کان معلوما عندھم انھم اذا اسفرغوامجھودھم فی استنباط ما شوروافیہ وثواب الرأی فیما سئلو عنہ ثم لم یکن ذلک معمولا علیہ ولا متلقی منہ بالقبول بوجہ لم یکن فی ذلک تطیب نفوسھم ولا رفع اقدارھم بل فیہ ایحاشھم وآلامھم بان آرائھم غیر مقبولۃ ولا معمول علیھا۔(۱)
>
> اور یہ جائز نہیں کہ مشاورت کا حکم محض صحابہ کی دلداری اور ان کی عزت افزائی کی خاطر دیا گیا ہو محض امت کو آپ کے طریقہ کی تعلیم دینے کے لیے دیا گیا ہو۔ اگر صحابہ کو یہ علم ہوتا کہ وہ زیر مشورہ امور میں سر کھپائی کر کے جب کوئی رائے قائم کر لیں گے تو اس پر نہ تو کوئی عمل ہوگا اور نہ ہی اسے قبول کیا جائے گا تو اس سے نہ ان کی دلداری ہوتی اور نہ عزت افزائی۔ بلکہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور جان لیتے کہ ان کی آراء نہ تو قبول ہوتی ہیں اور نہ ہی عمل درآمد کے لیے لی گئی ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فقہائے کرام نے رسول اللہ ﷺ کی سنت سے یہ درست مفہوم اخذ کیا ہے کہ مشاورت کے بعد شوریٰ کے فیصلوں کو قبول بھی کیا جائے اور ان پر عمل درآمد بھی اور اس کا واضح ثبوت یہ ہوتا ہے کہ شوریٰ کے متفقہ فیصلوں کو خلیفہ ویٹو نہیں کر سکتا البتہ خلیفہ اس بات کا پابند نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قطعی اور واضح احکام کی

تنفیذ کے معاملے میں شوریٰ سے مشورہ حاصل کرے۔اور اس کے فیصلوں کا پابند بھی ہو بلکہ اس کی واضح اور صریح ذمہ داری شریعت کے قطعی احکام کی ہر صورت میں تنفیذ ہے۔

۳۔ عدل:

عدل وہ اہم ترین اصول ہے جس پر اسلامی نظام حکومت کی بناء رکھی گئی ہے۔عدل صفت عام کے ساتھ اللہ کے حکم کو نافذ کرنا بغیر کسی تفریق کے اور یہ تنفیذ بشمول انبیاء علیہم السلام کے ہر حاکم پر واجب ہے۔اس پر علماء کا اجماع ہے۔قرآن وسنت کی صورت میں ملنے والے احکام الٰہی سب پر یکساں نافذ کیے جاتے ہیں جن میں کسی طرح کے امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ۔ کیونکہ عدل ہی دین و دنیا کا قوام ہے اور اسی پر زمین و آسمان کھڑے ہیں۔عدل کی ضد ظلم ہے جس سے معاشرے خراب اور حکومتیں زوال آشنا ہو جاتی ہیں اسی لیے قرآن حکیم کی متعدد آیات میں عدل گستری کا حکم دیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔(۱)

بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو اور بھلائی کرو☆

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔(۲)

اور جب بھی فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو انصاف سے۔☆

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔(۳)

اور جب کبھی بات کہو تو انصاف کی کہو اگر چہ ہو (معاملہ) رشتہ دار کا ☆۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى .(٤)

اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے انصاف کے ساتھ اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔☆

قرآن حکیم نے صرف عدل کرنے کا مطالبہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کے مقابلہ میں ظلم کی قطعی صراحت کے ساتھ مذمت بھی کی ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۚ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ۔(۵)

اور مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں۔ وہ تو انہیں صرف ڈھیل دے رہا ہے اس دن کے لیے جب کہ کھلی کی کھلی رہ جائیں گی آنکھیں۔☆

قرآن حکیم میں نبی ﷺ کے عدل کے حوالہ سے اس اعلان کو بھی بیان کیا ہے:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔(٦)

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عدل کروں تمہارے درمیان۔☆

اسی لیے نبی کریم ﷺ کی احادیث سے بھی عدل کے لازم ہونے اور ظلم کی حرمت پر دلائل ملتے ہیں۔

ان احب الناس الی الله یوم القیامة و ادناهم منه مجلساً امام عادل و ابغض الناس الی الله و ابعدهم منه مجلسا امام جائر۔(۷)

بے شک اللہ کے نزدیک لوگوں میں قیامت کے دن سب سے پسندیدہ اور زیادہ قریب امام عادل ہوگا اور سب سے ناپسندیدہ اور اللہ سے

زیادہ دور ظالم حکمران ہے۔

اتقوا الظلم ، فان الظلم ظلمات یوم القیامة۔(۱)

ظلم سے بچو اس لیے کہ ظلم قیامت کے ظلمات میں سے ہے۔

الغرض اسلام میں مطلق عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے جس میں حاکم و محکوم سب ہی شامل ہیں بلکہ تمام انسانیت عدل کے اس دائرے میں شامل ہے۔ اسی بناء پر اسلامی نظام حکومت میں اقلیتوں کے حقوق کی بھی ضمانت فراہم کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ دین اسلام کو قبول کرنے کے حوالے سے ان پر ہر طرح کے جبر و اکراہ سے بھی منع کر دیا گیا ہے۔ ان کے مال و منال اور عزت و حرمت کے علاوہ ان کی عبادت گاہوں تک کا تحفظ اسی اصول عدل کی بدولت اسلامی نظام حکومت میں اقلیتوں کو میسر آتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں اصول عدل کا رسوخ اس قدر ہوتا ہے کہ خلیفہ کو بھی احکامات کے حوالے سے کوئی استثناء حاصل نہیں ہوتا۔ شریعت میں جو حلال ہے وہ سب کے لیے حلال اور جو حرام ہے وہ سب کے لیے ہی حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مفہوم کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

انما هلك من كان قبلكم انهم كانوا يقيمون الحد على الوضيع و يتركون الشريف ، والذى نفسى بيده لو ان فاطمة فعلت ذلك لقطعت يدها۔(۲)

تم سے پہلے لوگ اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ کم درجے والوں کو سزا دیتے اور بالا درجے کے لوگوں کو چھوڑ دیتے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر فاطمہ (بنت محمد ﷺ) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔

۴۔ مساوات:

عدل کے اصول میں ہی مساوات کا مفہوم بھی شامل ہے اس لیے کہ عدل کا تقاضا

ہے کہ معاملات میں مساوات برتی جائے۔مساوات صرف قانونی مساوات ہی نہیں ہوتی بلکہ معاشرتی سطح پر مساوات زندگی کے ہر ایک دائرے کو محیط ہے۔ اصول مساوات کی اہمیت کو قرآن حکیم میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے۔

يٰاَيُّهَاالنَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔(۳)

اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنا دیا ہے تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔☆

رسول اللہ ﷺ نے اس مفہوم کی تائید وتاکید اس طرح فرمائی کہ:

لافضل لعربی علی اعجمی ولا لاعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی۔(۱)

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کسی کالے کو گورے پر، ماسوائے تقویٰ کے۔

متذکرہ بالا نصوص میں جس مساوات کا ذکر کیا گیا ہے وہ مطلق ہے اس میں کسی قسم کی کوئی قید روا نہیں رکھی گئی اور نہ ہی کوئی استثناء دیا گیا ہے۔یہ وہ عالمگیر مساوات ہے جو اسلامی نظام حکومت کی بنیاد ہوتی ہے۔اس میں کسی فرد کو دوسرے فرد پر یا کسی جماعت کو کسی دوسری جماعت پر بحیثیت عمومی کوئی فضیلت اور امتیاز حاصل نہیں۔حضرت عمرؓ نے اپنے سپہ سالار کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان کی توجہ ان الفاظ میں دلائی:

لیس بین اللہ وبین احد نسب الا بطاعۃ، فالناس شریفھم

ووضیعھم فی دین اللہ سواء ۔(۲)

اللہ تعالیٰ اور کسی شخص کے درمیان کوئی نسبی رشتہ داری نہیں ہے مگر صرف اطاعت کا تعلق ہے پس اللہ کے دین میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

اسلام نے مساوات کے ذریعے معاشرے کا معیار بلند کر کے اسے شاہراہ ترقی پر گامزن کر دیا اور اس اصول کی بناء پر ہی اسلامی نظام حکومت کو ایک دائمی کمال کی صفت سے متصف کر دیا گیا۔ اس اصول کے تحت یہ تعلیم دی گئی کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت اور مرد کے درمیان باوجود تفریق جنس کے مساوات کا اصول کارفرما رہتا ہے؟ اسلام جس مفہوم میں عورت اور مرد کی مساوات کا داعی ہے وہ یہ ہے کہ جس نفس واحدہ سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا کیا ہے اسی نفس واحدہ سے عورت کو بھی:

یٰٓاَیُّھَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً۔(۱)

اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں)۔☆

جس طرح مرد انسانی معاشرے کا ایک اہم رکن ہے اسی طرح عورت بھی معاشرے کے اہم رکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشرے کا وجود اس کی بقاء اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک پر منحصر نہیں بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح مرد کے حقوق و فرائض ہیں اسی طرح عورت کے بھی حقوق و فرائض ہیں۔ مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں توازن قائم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ۔(۲)

اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔☆

اس ترجیح کی نوعیت اور اس کی وجہ دوسرے مقام پر اس طرح بیان کی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔(۳)

مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر اس وجہ سے کہ فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر اور اس وجہ سے کہ مرد خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں سے (عورتوں کی ضرورت و آرام کے لیے) تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں (مردوں کی) غیر حاضری میں اللہ کی حفاظت سے۔☆

اس سے پتہ چلتا ہے کہ باہم مشترک معاملات میں مرد کو عورت پر یک گونہ فوقیت حاصل ہے مگر بحیثیت انسان اور معاشرے کے فعال رکن کی حیثیت سے ان کے درمیان ایک مساوات قائم کر دی گئی ہے۔ مرد کو جو فوقیت اور ترجیح حاصل ہے وہ دراصل اس کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو باحسن پورا کر سکے۔ گویا مرد کو زیادہ فرائض کی بناء پر ترجیح دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی عورت اور مرد کے دائرہ کار اور مسئولیت میں بھی ان کی مساوات کو اجاگر کرتا ہے:

الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته فالامیر الذی علی الناس راع و هو مسئول عن رعیته والرجل راع علی اهل بیته وهو

مسئول عنهم والمرأة راعية على بيت بعلها و ولده و هى مسئولة عنهم والعبد راع على مال سيده و هو مسئول عنه الا فكلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته۔(۱)

تم میں سے ہر شخص سردار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔امام سردار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا مرد اپنے گھر والوں کا نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگران ہے سو اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔اور ایک غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔خبردار! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

مساوات کی ایک اور فرع احترام انسانیت بھی ہے جس کا اعلان قرآن حکیم میں اس طرح کیا گیا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ۔(۲)

اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو۔☆

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

ان دمائكم و اموالكم عليكم حرام الى ان تلقوا ربكم كحرمة يومكم هذا۔(۳)

بلا شبہ تمہاری جان و مال ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہے جس طرح کہ آج کا یہ دن، حتی کہ تم اللہ سے جا ملو۔

پس مساوات کو قائم رکھتے ہوئے انسانیت کے ناطے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ کسی انسان کی تذلیل کی جائے اس کی عزت و ناموس اور اس کی شخصی آزادی میں مداخلت کی جائے۔اس میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔جرائم کی سزاؤں کے حوالے سے بھی انسانیت کی تحقیر سے اجتناب برتا گیا ہے اس لیے کہ سزا کا مقصد اصلاح اور زجر ہوتا ہے نہ کہ کسی کی اہانت و تذلیل۔اسی لیے شرعاً یہ جائز نہیں کہ کسی کو گالی دی جائے اس کو برا بھلا کہا جائے یا اس کا مذاق اڑایا جائے یا اس کی عزت پر حرف گیری کی جائے حتی کہ یہ چیزیں اسلام نے جنگ کے غیر معمولی حالات میں بھی ممنوع قرار دے رکھی ہیں۔

۵۔ شخصی آزادی:

شخصی آزادی بھی تکریم انسانیت کا ایک لازمہ ہے۔یہ ہر انسان کا ایک فطری اور پیدائشی حق ہے۔اسی تناظر میں حضرت عمرؓ نے مصر کے گورنر عمرو بن العاصؓ سے فرمایا:

قال عمر لعمر مذکم تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا (۱)۔

حضرت عمر نے عمرو بن العاص سے کہا کہ تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنالیا حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

اسلامی نظام حکومت میں ہر قسم کے جبر و استحصال سے ہر فرد کو شخصی آزادی کی ضمانت فراہم کی گئی ہے۔اس لیے اسلامی حکومت کے سربراہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلامی نظام حکومت کے تحت بسنے والوں کو زندگی کے تمام مظاہر میں آزادی فراہم کرے۔خود قرآن حکیم نے افراد کے لیے حریت عقیدہ اور آزادی اظہار رائے کا اعلان کر رکھا ہے۔ذیل میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر ایک پر الگ الگ بحث کی جارہی ہے۔

۱۔ **حریت عقیدہ:** شریعت اسلامیہ دنیا کا وہ اولین دین ہے جس نے نہ صرف عقیدہ کی آزادی بخشی ہے۔بلکہ اس آزادی کی حفاظت بھی کی ہے۔اسی لیے قرآن حکیم

نے کسی بھی عقیدہ کو اختیار کرنے کے لیے جبر و اکراہ سے منع کر دیا ہے:

لَآاِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔(۲)

کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں۔ بے شک خوب واضح ہو گئی ہے ہدایت گمراہی سے☆

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْن ۔(۳)

کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔☆

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔(۴)

پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے۔☆

اعتقاد کی آزادی کے حوالے سے سید مودودی نے تحریر کیا ہے:

ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہی کا قیمتی حق تھا جسے حاصل کرنے کے لیے مکہ کے سیزدہ دور ابتلاء میں مسلمانوں نے ماریں کھا کھا کر کلمہ حق کہا۔ اور بالآخر یہ حق ثابت ہو کر رہا۔ مسلمانوں نے یہ حق جس طرح اپنے لیے حاصل کیا تھا اسی طرح دوسروں کے لیے بھی اس کا پورا پورا اعتراف کیا۔ اسلامی تاریخ اس بات سے خالی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو یا کسی قوم کو مار مار کر کلمہ پڑھوایا ہو۔(۱)

اس آزادی عقیدہ کی بناء پر ہی اسلام نے مذہبی دل آزاری سے منع کر رکھا ہے:

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔(۲)

اور تم نہ برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا۔☆

اسلام میں مذہبی معتقدات پر مناقشہ و بحث کے لیے بھی اس طریقہ کی ہدایت کر دی گئی جس میں نہ تو کسی کی مذہبی دل آزاری ہو اور مذہبی اعتقاد کی آزادی پر کوئی زد پڑے ۔قرآن حکیم میں اس طریقہ بحث کی ہدایت اس انداز میں کی گئی ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔(۳)

اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقہ سے مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے اور تم کہو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تھا تمہاری طرف اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔☆

۲۔ **آزادی اظہار رائے:** شریعت اسلامیہ نے آزادانہ رائے قائم کرنے کی بھی اجازت دے رکھی ہے اور اس کے اظہار کی بھی آزادی اسلامی نظام حکومت کا ایک اہم اصول ہے۔ جہاں تک رائے قائم کرنے کا تعلق ہے تو اسلام خود انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور پھر ایک رائے قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے حتی کہ عقیدہ کے معاملہ میں بھی اسلام کا یہی مزاج ہے۔ بلکہ اسلام نے کورانہ تقلید کی مذمت کی ہے قرآن حکیم اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔ (٤)

اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے

ہوں نہ ہدایت یافتہ ہوں۔☆

اور وہ صاحبان فکر جو غور و فکر کے بعد اپنی رائے قائم کرتے ہیں انکے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَاب۔(۱)

اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقل مند۔☆

قرآن حکیم کی اکثر آیات جو عقیدہ کے بیان پر مشتمل ہیں ان کے آخر میں لقوم یعلمون، یعقلون ، یتفکرون، یتدبرون وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام عقیدہ کے معاملے میں بھی غور و فکر کی تعلیم دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص غور و فکر کے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔اسی طرح اسلام نے نہ صرف رائے قائم کرنے کی عام اجازت دے رکھی ہے بلکہ آزادی اظہار کے حق کو بھی ہر انسان کے لیے تسلیم کر رکھا ہے یہ آزادی اظہار نہ صرف ایک حق ہے بلکہ قرآن اسے ایک فرض کے طور پر متعارف کرواتا ہے۔اور اس سے معاشرے کی فلاح و صلاح کا کام لیتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔(۲)

ضرور ہونی چاہیے تم میں سے ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے۔☆

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔(۳)

وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو) نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔☆

قرآن حکیم نے بنی اسرائیل کے تنزل کے اسباب و وجوہ میں سے ایک کا ذکر اس طرح کیا ہے :

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۔(٤)
نہیں منع کیا کرتے تھے ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔☆

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن میں آزادی اظہار رائے وہ فرض ہے کہ جو معاشرے کے حالات کو سدھارنے کا کام دیتا ہے کیونکہ اگر معاشرے میں کوئی غلطی رواج پاجائے یا برائی پھیلنے لگے اور کوئی بھی اس کی نشاندہی نہ کرے تو بالآخر پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خود رسالتمآب ﷺ نے آزادی اظہار رائے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کے نتیجے میں کی جانے والی نشان دہی پر عمل درآمد بھی کیا:

عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جده انه قام الى النبى ﷺ وهو يخطب فقال جيرانى بما اخذوا؟فاعرض عنه مرتين ثم ذكر شيئا فقال النبى ﷺ خلوا له عن جيرانه ۔(١)
بھز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے دادا) نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔انہوں نے سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے دو مرتبہ ان کے سوال کی طرف توجہ نہ فرمائی۔لیکن انہوں نے (سائل نے) پھر کچھ کہا۔تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے پڑوسیوں کو چھوڑ دیا جائے۔

بلاشبہ اسلامی نظام حکومت کا یہ اصول ہے کہ وہ آزادی اظہار رائے کو یقینی بناتی ہے اور ہر شخص کو اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ وہ بغیر کسی ظلم وتعدی کے جو چاہے سو کہے مگر اسے

یہ چاہیے کہ وہ نہ کسی کو گالی دے، نہ عیب لگائے نہ تہمت اور نہ جھوٹ بولے بلکہ پوری دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض نبھاتے ہوئے اچھی بات کہے اور بری بات کہنے اور کرنے سے روکے تاکہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر مفاد عامہ کے کاموں میں ترقی ہوتی رہے۔ کیونکہ اسلام کے تصور حکومت میں اجتماعی مصالح کو بہر حال فوقیت حاصل رہتی ہے۔